اردو
انشائیہ
سید صفی مرتضیٰ
ایم۔ اے

اُردو انشائیہ

از

سیّد صفی مُرتضیٰ

مع

مُقدّمہ

جناب سیّد احتشام حسین صاحب

قیمت

مجلد تین روپیہ

ناشر

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

ٹیلیفون ۴۵۵۹

ناشر:۔ عزیز الرحمٰن (بار اول۔ جولائی ۱۹۶۱ء) پرنٹر:۔ شاہی پریس لکھنؤ

فہرست

مضمون		صفحہ
الّو	خواجہ حسن نظامی	۱۱۶
چراغ	پیارے لال شاکر	۱۲۲
شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے	رشید احمد صدیقی	۱۳۰
ایک مصوّر فرشتہ	نیاز فتحپوری	۱۴۰
داماد کا انتخاب	سجّاد حیدر یلدرم	۱۴۶
کُتّے	پطرس بخاری	۱۵۴
تکیہ کا غلاف	شوکت تھانوی	۱۶۲
میں نے پڑھا ہے	عظیم بیگ چغتائی	۱۷۰
ہمارے میر صاحب	سید سخی حسن	۱۸۰

تعارف

سیّد احتشام حسین صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی)

اِدھر کچھ دنوں میں اس خاص قسم کے مضامین کے لئے جنھیں انگریزی میں "ایسے" کہا جاتا ہے، "اِنشائیہ" کی اصطلاح عام ہو گئی ہے اور بظاہر مناسب بھی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ مخصوص قسم کے مضامین عام علمی مقالوں، مضمونوں اور دوسرے انشاپردازی کے نمونوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ویسے اس طرح کے اَدبی مضامین عربی اور فارسی میں بھی مل جاتے ہیں جن کا اصل مقصد کوئی معلومات فراہم کرنا نہیں، بلکہ محض اِنشاپردازی کا زور دکھانا اور بعض علمی اور تہذیبی موضوعات کی طرف ذِہن کو منتقل کر کے چھوڑ دینا ہوتا ہے، لیکن اُردو اور بعض دوسری مشرقی زبانوں میں ایسے تمام اَدبی مضامین اُنیسویں صدی سے اس وقت تک مغربی اَدب کے تاثر کا نتیجہ کہے جاسکتے ہیں اس لئے اِن مضامین پر نظر پڑتے ہی انگریزی اور بعض دوسری یُوروپی زبانوں کی طرف ذہن مُنتقل ہوجاتا ہے اور "اِسے" کی خصوصیات کا تصوّر کئے بغیر اُردو اِنشائیوں کے حُسن و قبح کو جانچا نہیں جاسکتا۔ گذشتہ ایک صدی میں اُردو اَدب کا دامن بھی اِنشائیوں سے مالامال ہوا ہے اور اگرچہ یہ کہنا دُرست

نہیں ہو گا کہ ہمارے یہاں بھی بیکن، لیمب، ہیزلٹ، اڈیسن، گولڈ اسمتھ اور اسٹیونسن جیسے اِنشائیہ نگار پیدا ہوئے لیکن اِتنا ضرور ہوا کہ اس صِنف نے اُردو نثر کو محض قصّہ کہانیوں یا مذہبی رسائل کیلئے کام میں لائی جانے والی زبان کی حدوں سے باہر نکال دیا اور تخیل کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔

گذشتہ کچھ سال اِنشائیہ کے لئے بہت سازگار رہے ہیں، اِن کے متعدد انتخابات مُرتب کئے گئے ہیں اور متعدد مضامین ان کی خصوصیات سے متعلق لکھے گئے ہیں، یہی نہیں بلکہ انھیں تحقیقی مقالات کا موضوع قرار دیا گیا ہے اور کم سے کم دو طالبعلموں نے اِنشائیوں ہی پر کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ میں اِسے اَدبی ترقی کے لئے ایک فالِ نیک سمجھتا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے جناب صفی مرتضیٰ صاحب کا مُرتب کردہ اِنشائیوں کا ایک انتخاب ہے جس کے شروع میں ایک دلچسپ اور فاضلانہ مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ انتخاب کا کام بہت مشکل ہوتا ہے اور یقیناً ہر شخص کو آسودہ نہیں کر سکتا لیکن میں اطمینان اور یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک نمائندہ انتخاب ہے جس میں ایک خوبصورت تنوّع پایا جاتا ہے۔ بعض نہایت حسین اور دلکش مضامین اِس لئے شامل کئے گئے ہیں کہ گو اُن کے لکھنے والوں کو اَدبی دُنیا میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں ہو سکا ہے لیکن اُن کے مضمون میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جنھیں ایک انشائیے میں تلاش کیا جانا چاہیئے۔

اِس چند سطروں کے تعارف میں اِنشائیے کی خصوصیات اور

اُردو انشائیہ نگاروں کی کامیابی یا ناکامی پر کچھ لکھنا تعارف نگاری کی حدوں کے باہر جانا ہے، پھر صفی مرتضیٰ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے مقدمہ میں یہ فرض انجام بھی دے دیا ہے، مجھے بس اِتنا ہی کہنا ہے کہ ابھی اُردو کے مضمون نگاروں کے سامنے ایک بہت بڑا میدان پڑا ہوا ہے جس میں اُنھوں نے قدم نہیں رکھا ہے۔ اُن میں مقاصد کو عزیز رکھنے والے، خوش فکر، ذہین، طبّاع، صاحبِ طرز اِنشاء پرداز ضرور موجود ہیں لیکن راز ہائے زندگی یا حیاتِ انسانی کے پیچ وخم پر ان کی گرفت ابھی مضبوط نہیں ہے، وہ شگفتگی جو مطالعۂ حیات کے حیرت انگیز استعجاب سے پیدا ہوتی ہے ابھی کھِل کر پھول نہیں بنی ہے۔ اِس لئے ہمارے انشائیے کبھی مدلّل ادبی اور تنقیدی مضامین کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی محض ایک فکاہی جنبشِ قلم بن کر رہ جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے مسرّت اور لذّت حاصل نہیں ہوتی۔ ادب میں علمی، معلوماتی اور عالمانہ مضامین کا بھی ایک مقام ہے، بعض فلسفیانہ مباحث پر ردّ و قدح کی بھی گنجائش ہے لیکن انشائیہ اس کی تاب نہیں لاسکتا، اُسے تو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیئے جو پڑھنے والوں کے ذہن پر منطق اور استدلال کے ذریعہ نہیں محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب مفکّرانہ اندازِ بیان کے ذریعہ اپنا تاثر قائم کرے۔ یہ باتیں کبھی کبھی اُردو کے انشائیوں میں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔

اُردو اِنشائیے کی خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی، اس کا وجود ایک ایسے دَور میں ہوا جب مقصدیت ادب اور شاعری کا جزو بن چکی تھی اور پہلے سے اس کی کوئی روایت موجود نہیں تھی اس لئے اُردو اِنشائیہ

اپنے تمام امکانات کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ ہمارے کئی اِنشائیہ نگاروں کو اُس کے اَدبی حُسن اور انشائی مقام کا احساس بھی رہا ہے، لیکن پھر بھی جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ابھی اس کو بہت طویل سفر کرنا ہے۔ اِنشائیہ کی ترقی کا سوال اُردو نثر کی ترقی سے وابستہ ہو۔ ہماری نثر جتنی جاندار ہوتی جائے گی، لِکھنے والوں کو زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں پر جتنی قدرت حاصل ہوتی جائے گی اُسی قدر انشائیہ میں روانی، شگفتگی، معنویت کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ اگر ہمارے اَدیبوں اور ناقدوں کی یہ توجہ وقتی نہیں ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس صنفِ ادب کے دِن پھریں گے۔

ہمیں صفی مرتضیٰ صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ موصوف نے ایک بہت ہی نمائندہ اِنتخاب ہمارے لئے مُہیا کر دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اِسے صرف طلباء اپنے لئے مفید نہیں پائیں گے بلکہ اس موضوع سے اور اُردو نثر کے خوبصورت نمونوں سے دلچسپی لینے والے بھی اس کا خیر مقدم کریں گے۔

لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ۔ سید احتشام حسین

مقدمہ

'مضمون' کا لفظ مادہ، اشتقاق اور ہیئت کے لحاظ سے عربی النسل ہے لیکن اردو میں جو مفہوم یہ پیدا کرتا ہے وہ خاص اردو ہی کی چیز ہے کیونکہ عربی میں اس مفہوم کو 'انشا' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر اردو میں جو مفہوم ہم تک پہنچا ہے وہ لفظ مضمون کے لغوی معنی سے کوئی مغائرت نہیں رکھتا اس لیے کہ عربی لغات میں مضمون کے معنی 'مافی اصلاب الفحول' ہیں یعنی وہ مادہ تخلیق جو حیوانات نر کی اصلاب میں ہو، اسلئے جس طرح عالم اجسام کی ہنگامہ آرائی اس مادہ تخلیق کی نیرنگیوں کی مظہر ہے اسی طرح ذہنی اور دماغی کائنات بھی بغیر کسی تخلیقی مادے کے عالم شہود میں نہیں آسکتی۔ اسلئے استعارۃً مضمون ہم اس تخلیقی خیال کو کہہ سکتے ہیں جو کسی کامل فن کے ذہن میں جنم لیتا ہے اور یہی وہ بنیادی مفہوم ہے جو اپنے پر پرزے نکال کر شعر و سخن کے احاطہ میں داخل ہوا اور شاعر کا خیال مضمون شعر بن گیا۔ اب وہ بلند بھی ہوا اور پست بھی، شریف و لطیف بھی قرار دیا گیا اور سوقیانہ اور ردی بھی۔ لیکن نثر میں اس کا استعمال بہت بعد کی بات ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کی صنف انگریزی کے اثرات سے پیدا ہوئی۔ انگریزی میں اسے Essay کہتے ہیں اور زیر نظر مجموعہ میں بھی مضمون کا لفظ Essay کے مترادف استعمال کیا گیا ہے۔ Essay ڈاکٹر جانسن کے لفظوں میں اس سرسری جودت ذہن کو کہتے ہیں جس میں کوئی خاص نظم یا سلیقہ درکار نہیں اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی جاتی ہے کہ Essay کو مختصر ہونا چاہیے۔ اسلئے جانسن کی تعریف کے مطابق مضمون ادب کی اس صنف کو کہیں گے جو خیالات کے سرسری توجہ کی ایک شکل ہو اور جس میں اختصار کا ایک حد تک لحاظ رکھا گیا ہو اس حد بندی سے مقالے اس تعریف سے خارج ہو جائیں گے

کیونکہ ان میں غور و فکر۔ تنظیم و تدوین اور طوالت و ضخامت پائی جاتی ہے مضمون کیلئے کسی موضوع کی قید نہیں بلکہ دنیا کی ہر چیز مضمون کا موضوع بن سکتی ہے۔

اردو میں چونکہ مضمون نگاری انگریزی کے تتبع سے آئی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی مضمون نگاری کی سرسری تاریخ دہرادی جائے جس سے اندازہ ہوسکے کہ وہاں اس صنف نے کیا کیا انداز اور اسلوب اختیار کئے۔

انگریزی میں Essay کا لفظ فرانسیسی لفظ Essai سے ماخوذ ہے جس کے معنی فرانسیسی زبان میں "کوشش" ہیں اور فرانس ہی سب سے پہلا ملک ہے۔ جہاں مضمون نگاری کی داغ بیل پڑی۔ پہلا مضمون نگار (Montaigne) مان ٹین ہوا اور جس نے اپنے خیالات کے لئے Essai کا لفظ استعمال کیا۔ انگریزی میں مان ٹین کے سترہ سال بعد فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء تا ۱۶۲۶ء) نے اپنے مضامین شائع کئے اگرچہ بیکن سے قبل بھی کچھ مصنفات میں مضمون نگاری کے اجالے نظر آتے ہیں لیکن تاریخی اہمیت کے علاوہ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اس لئے انگریزی مضمون نگاری کا بانی فرانسس بیکن ہی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

بیکن ایک متبحر عالم تھا اور اس کے قاموسی ذہن میں علوم کا خزانہ جمع تھا وہ اپنے مضامین کو "افکار پریشاں" لکھتا ہے ان مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی فلسفی کے افکار ہیں ابتدائی مضامین میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بلند مطالب اور عمیق خیالات سمو دیئے ہیں ان جملوں میں ربط کی کمی کا عیب پایا جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ نقص جاتا رہا اور جملوں میں نظم و ربط پیدا ہوگیا اور انداز میں رنگ و آہنگ اور تشبیہ و استعارہ کے تصرف نے فلسفیانہ یبوست کو کم کردیا لیکن فلسفی پھر فلسفی ہی رہا۔

بیکن کے بعد سترھویں صدی کے نصف اول میں کردار نگاروں کی ایک جماعت ابھری جنھوں نے مختلف کردار طنز و ظرافت کے رنگ میں لکھے مثلاً جوزف ہال۔ سر تھامس اوربری

اور جان الل بیکن اور ایڈیسن کو ملانے والی کڑی ابراہیم کاولی تھا اسکے مضامین اگرچہ عالمانہ اور فلسفیانہ کم ہیں لیکن اس نے عام موضوعات کو لیا اور سہل زبان میں ان پرانے خیالات کا اظہار کیا اسکے مضامین شخصی نوعیت کے ہیں اسکے خیالات کی روداد طریقہ اظہار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے وہ مضمون نگار تھا

دور اصلاح (۱۶۶۰ء تا ۱۷۸۰ء) میں ہیلی فاکس ٹیمپل اور ڈرائڈن کے نام ملتے ہیں جو بہترین مضمون نگار تھے اٹھارھویں صدی میں پریس کی ترقی اور طباعت کی سہولتوں نے مضمون نگاری کی صنف کے نشو و نما میں بڑا کام کیا اور ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کے اجرانے دوسرے رسالوں کے لئے راہ ہموار کردی مذکورہ دو رسالوں سے ایڈیسن اور اسٹیل کے نام وابستہ ہیں۔ اسٹیل کو قدرت کی طرف سے تخلیقی قوتیں ایڈیسن سے زیادہ ملی تھیں لیکن مجموعی حیثیت سے ایڈیسن بہترین فنکار ہے اگرچہ اسٹیل میں کھلی ہوئی بے باکی، کشادہ دلی کے ساتھ انسان دوستی کے جوہر ملتے ہیں لیکن طنز کے نشتروں میں برش کی کمی ہے ایڈیسن کی تمام تر جد و جہد اخلاقیات میں ظرافت کی روح پھونکنا اور ظرافت میں اخلاقیات سمونا ہے۔ اس لئے وہ ایک خوش مزاج محتسب نظر آتا ہے ایڈیسن نے مختلف موضوعات پر چار سو مضامین لکھے۔

رسائل کے مضمون نگاروں میں پوپ اور سوئفٹ بھی تھے پوپ تو رسائل کی مضمون نگاری کے لئے موزوں تھا لیکن سوئفٹ فطرتاً اس صنف کے لئے اہل نہ تھا اس کی ظرافت بھدی اور بناوٹی تھی۔

ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کے بعد اور بہت سے رسالے ابل پڑے اور ان کے ساتھ مضمون نگاروں کی تعداد بھی کثیر ہوگئی ان لوگوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی جن میں ہنری فیلڈنگ۔ سیموئیل جانسن اور گولڈ اسمتھ کے نام خاص طور پر ممتاز ہیں فیلڈنگ کے مضامین اپنے محاسن میں بے مثل ہیں اگرچہ ان میں سے کچھ بے پروائی کے زخم خوردہ ہیں لیکن جن پر توجہ اور محنت صرف کردی گئی ہے وہ قابل تعریف

ہیں ان میں ذوق د زندگی کی تنقیدیں اور وسیع انسانیت کی کشادہ نظری ملتی ہیں جانسن بہت مقبول ہوا یہاں تک کہ اس کا انداز نگارش "جانسنی اسلوب" کے نام سے مشہور ہوا اسکے اسلوب کی خصوصیت بڑے بڑے الفاظ کا استعمال اور لاطینی اثر ہے گولڈ اسمتھ اٹھارھویں صدی کا سب سے بڑا مضمون نگار تھا اس کے اکثر مضامین میں بے باکی اور جدت پائی جاتی ہے اور اسلوب میں وہ دلکشی ہے جو قاری کو بغیر مسحور کئے نہیں رہتی اس دلکشی کے اسباب میں اس مادہ ظرافت کو بھی شامل کرنا پڑیگا جو دوسروں کیلئے ناقابل تقلید ہے۔

گولڈ اسمتھ کے بعد رسائل میں ادبی قسم کے مضامین میں کمی نظر آنے لگی۔ سترھویں صدی کے ختم اور اٹھارھویں صدی کے آغاز میں لی ہنٹ اور دلیم ہیزلٹ ممتاز مضمون نگار ملتے ہیں۔ ہنٹ کے لہجہ میں خود اعتمادی کی قوت ہے۔ اور ہیزلٹ انگریزی مضمون نگاروں کی صف اول کا ادیب ہے اس کی تحریر میں ایک قسم کا جوش اور اشتعال ہے جو ادبی احتظاظ میں قاری کو اپنا ہم ساز اور ہم آہنگ بنا لیتی ہے۔ ہیزلٹ کے اسلوب میں خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر موقع اور محل کے مناسب الفاظ استعمال کرتا ہے نیز دوسرے مصنفوں اور ادیبوں کے فقرے جا بجا اسکے مضامین میں حوالہ کے طور پر کثرت سے ملتے ہیں۔

چارلس لیمب (۱۷۷۵ء تا ۱۸۳۴ء) انگریزی مضمون نگاروں کا بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ اس کے مضامین فن کے نقطہ عروج پر پہنچے ہوئے ہیں کسی مضمون نگار کے حصہ میں وہ دلکشی نہیں آئی جو لیمب کو ملی ہے۔ لیمب کے مضامین اس کی شخصی زندگی کے عکاس ہیں۔ اس کی برائیں اس کی پسند اس کی نفرت اس کے اعزا اس کے احباب سب پر یہ مضامین روشنی ڈالتے ہیں اس لحاظ سے لیمب کے مضامیں اسکے خود نوشت سوانح ہیں وہ اپنے قاری کو اپنا ہم راز بنا کر اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتا ہے

لیمب کے مضامین میں دل و دماغ دونوں کی ضیافت کا سامان موجود ہے وہ حکمت و فلسفہ بھی ہیں اور شاندار انسانیت بھی۔

وکٹوریائی عہد میں میکالے (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۹ء) نے تاریخ انگلستان سے متعلق مضامین لکھے میکالے کو تاریخی مضامین کا بانی سمجھنا چاہیئے۔ تاریخ میں یہ دلکشی اور زیبائی میکالے سے قبل کوئی نہیں پیدا کر سکا۔ میکالے کے اسلوب میں تاثیر شگفتگی اور حسن پایا جاتا ہے مثالوں کی کثرت سے اسکا نقطہ نظر واضح اور جاندار ہو جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کے ابہام کی گنجائش نہیں رہتی۔ خطابی انداز و بیان نے اسکے ادب کو رفعت بخشی ہے مگر یہ کہ ظرافت میں لطافت کی کسی قدر کمی ہے۔

میکالے کے علاوہ کارلائل۔ رسکن۔ نیومین۔ آرنلڈ۔ بالترتیب تاریخ معاشیات دینیات اور ادبی تنقید کے شعبوں میں ممتاز مضمون نگار نکلے جنھوں نے اپنے پسندیدہ موضوعات پر بلند پایہ مضامین سے انگریزی ادب میں اضافہ کیا۔

اسٹیونسن (۱۸۵۰ء تا ۱۸۹۴ء) پیدائشی مضمون نگار تھا کیونکہ معمولی موضوعات پر لکھنے کا گرو جانتا تھا۔ اس کی ذہانت ہمہ گیر تھی اور لیمب کے بعد مضمون نگاری کی مسند اسی کو ملی اس کے مضامین میں اس کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے دل میں اس کی شخصیت محبوب بن جاتی ہے نیز اس کے لہجہ میں واعظ کی شیریں زبانی اور معلم اخلاق کی نرم گفتاری سموئی ہوئی ہے الفاظ کے استعمال میں وہ فنکار ہے اور چونکہ اس کے الفاظ میں باعمل انسان سے ہمدردی کا مخلصانہ جذبہ مضمر ہے اسلئے اسٹیونسن کو محض الفاظ کا بازی گر نہیں کہا جا سکتا۔

عصر حاضر میں چیسٹرٹن شاعر ناول نگار مضمون نگار ناقد سب کچھ ہے لیکن مضمون نگار سے زیادہ صحافی ہے۔ بلاک کے مضامین موجودہ عہد میں سب سے بہتر ہیں۔ اس کے اسلوب میں صفائی اور ظرافت خصوصیت سے قابل لحاظ ہیں۔ بائرل کے مضامین

مختلف عنوانوں کے ماتحت ہیں اس کے مضامین کے مطالعہ سے قاری کے دل میں
ادب اور ادیبوں کی قدر و محبت بڑھتی ہے لیوکس لیمب کا پرتو ہے کیونکہ اسکے اندر
بھی وہ دلکشی اور ظرافت پائی جاتی ہے جو لیمب کی خصوصیت تھی۔ لیوکس میں تنوع ہے
اس کے کچھ مضامین زندہ دلی اور ظرافت کا نمونہ ہیں اور کچھ عمیق اور سنجیدہ فکر کا۔
کچھ سطحی ہیں تو دوسرے ٹھوس اور خالص علمی مواد سے پُر ہیں اے جی گارڈنر کے
مضامین کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا لکھنے والا ایک ہشاش بشاش اور دلچسپ
شخصیت کا مالک ہے جس میں جذبہ ہمدردی روشن دماغی اور خوش دلی پائی جاتی
ہے اس کے مضامین کے عنوانات انوکھے اور دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کے ماتحت
بہت سوچی سمجھی اور گہری باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے اسلوب میں روانی زندہ دلی ظرافت
اور ادبی و تاریخی تلمیحات کے خصائص ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں انگریزی مضمون نگاری کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا گیا ہے
تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کس قسم کے میلانات اور کیا کیا اسالیب بیان انگریزی کے
پیش نظر رہے ہیں کیونکہ یہی وہ ادب تھا جس کے مطالعہ سے اردو والوں کی آنکھیں
روشن ہوئیں اور اردو مضمون نگاری شروع ہوئی۔

اردو میں مضمون نگاری جس وقت شروع ہوئی اس وقت یہ زبان اپنی عمر کی
کئی صدیاں گزار چکی تھی لیکن کسی زبان کی نشو و نما کے لئے صدیوں کی حقیقت کیا۔
اول تو یہ بازاروں میں پھرتی رہی اور صرف عوام سے سابقہ رہا پھر بزم شعرا میں
دخیل ہوئی نغمہ و موسیقی کی تانیں اسے لے اڑیں ایک طرف خانقاہوں کی مقدس
فضا میں سبحہ و سجادہ سے دست بوس تھی تو دوسری طرف درباروں میں رامش و رنگ
کی ندیم۔ شاعری پر قابو پا لینے کے بعد نثر کے میدان میں قدم رکھا تو داستانوں
فقہ و تصوف کے رسالوں میں نظر آنے لگی جیسا ماحول پایا اسی سے ساز کھانے لگی

جیسا اسوقت کا سماج تھا اور جو اسکی دلچسپیاں تھیں انہی میں یہ بھی شریک تھی اسوقت نہ علمی ماحول تھا نہ اس ماحول کو بدلنے کی کوشش کے آثار کسی طرف سے ظاہر ہو رہے تھے پھر اردو زبان ہی کیا کرتی اور مضمون نگاری اس میں کہاں سے شروع ہوتی ۔ فارسی زبان کا چرچا تھا لیکن اس میں بھی یہ صنف نہ ہونے کے برابر تھی کچھ اخلاقی درسیات تھیں جن میں کسی نے اخلاقی موضوع پر نہایت سنجیدہ اور خشک انداز میں صفحہ در صفحہ لکھ دیا تھا اسکا اثر اردو پر نہ پڑ سکا کیونکہ اس کا مقصد مضمون نگاری نہ تھا بلکہ درس اخلاق تھا لیکن جب انگریزی حکومت قائم ہوئی اور انگریزی تعلیم نے رواج پایا اور انگریزی ادب کی مختلف اصناف سے ہندوستانی روشناس ہوئے تو مضمون نگاری کی صنف بھی نگاہوں کے سامنے سے گزری

جس وقت اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی یہ زمانہ ہندوستان کی نئی زندگی کا عہد تھا اور بنگال اس نشاۃ الثانیہ میں پیش رو تھا ۔ غدر کے بعد ہندوستان میں دو ایسی قوموں کا اتصال ہوا جو اپنے رنگ کی طرح اپنے کلچر اپنی زبان اپنی روایات اور اپنے عقائد میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں ایک طرف ہندوستانی تھے جن کی قوت عمل کو عیش و عشرت نے چوس لیا تھا ۔ غدر کے سیاسی یا نیم سیاسی میدان میں شکست کھا جانے کے بعد رہی سہی امیدوں پر بھی اوس پڑ گئی اور وہ ایک بے حس و حرکت قوم نظر آنے لگے ۔ عقل و خرد کے سوتے خشک ہو رہے تھے اور حکمت و تدبر کی جولانی نے فرار کی شکل اختیار کر لی تھی دوسری طرف ایک نئی قوم تھی جو فاتحانہ انداز سے داخل ہوئی تھی انھوں نے یہ میدان عقل و دانش سے جیتا تھا وہ سیاست کی ماہر علوم و فنون میں آگے اور سائنس میں منفرد تھی ۔ سائنس نے انھیں مشینیں دیں مشینوں نے سامان تجارت دیا تجارت نے منڈیاں تلاش کیں اور منڈیوں سے سیم و زر کا سیلاب امنڈ کر ساحل انگلستان سے ٹکرانے لگا ۔ سرمایہ داری سے زندگی کا معیار بلند ہو گیا ۔ ایسی دو قومیں ہندوستان میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں ۔ بڑھے ہوئے حوصلے شکستہ ہمتوں کے مقابل تھے ۔

ہندوستانیوں کے احساس کمتری کا یہ منظر بڑا بھیانک اور تاریک تھا پریس کو قدرے آزادی مل گئی تھی اور اخبارات نکل رہے تھے لیکن ان کی آواز بہت مدھم تھی اور جو صرف خبروں کے نقل کر دینے کا فرض پورا کر رہے تھے۔ ایسے عالم میں سرسید نے انگلستان سے واپس آکر ایک رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کا پہلا نمبر ۲۴ ردسمبر ۱۸۷۰ء کو نکلا جو ۱۸۷۶ء تک جاری رہا دوسری مرتبہ ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۱ء تک اور تیسری بار ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۶ء تک چلا اس رسالہ نے اردو زبان کی ترقی میں اہم خدمت انجام دی۔ اور مضمون نگاری کی بنیاد ڈالی اس رسالہ کے ایڈیٹر اور مینجر تو سرسید تھے مگر محسن الملک وقار الملک چراغ علی وغیرہ اس کے خاص مضمون نگاروں میں تھے زیادہ مضامین سرسید ہی کے شائع ہوتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے قلمی معاونین کے علاوہ مولانا حالی۔ ذکاء اللہ نذیر احمد محمد حسین آزاد وحید الدین سلیم سب نئے ساز زندگی کے تار تھے اور مضمون نگاری کے پہلے دور کے معمار۔ ان سب کے مضامین کی روح اصلاح قوم میں مضمر تھی ان کے مواضیع کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ امید کی طاقت قوم کے جسم میں پیدا کرنا چاہتے تھے اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو ثبات واستقلال سے جمانا چاہتے تھے یہ تمام مضامین اصلاح کے مقصد کے ماتحت لکھے گئے ہیں خواہ وہ سیاسی اصلاح ہو یا معاشرتی۔ اخلاقی ہو یا منزلی۔ ان سب کے سامنے صرف ایک مقصد تھا اور ایک ہی منزل پر پہنچنا ان کے پیش نظر "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" صرف ایک کا نہیں بلکہ ان سب کا نعرہ تھا۔ یہ مضامین جہاں اپنے مضمون نگاروں کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں وہاں اس عہد کی سماجی زندگی اور نظام معاشرت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں ان مضمون نگاروں نے عام اور معتدی کمزوریوں کی تشخیص کی اور ان پر قلم اٹھایا "اپنی مدد آپ" کے پردہ میں کم ہمتی کا حال معلوم ہوتا ہے "گھر کی تربیت" میں وردن خانہ کی معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ "زبان گویا"۔ تخیلی سہی لیکن

خیال کی بنیاد بھی کسی مادہ پر ہوتی ہے اور وہ مادہ بیکاروں کے جھگڑے میں زبان کا بیجا مصرف تھا۔ "کفایت شعاری" مسرف اور عیش و عشرت کی عادی طبیعتوں کے لئے ایک جھنجھوڑ ہے اسی طرح دوسرے مضامین اپنے وقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ "گلشن امید کی بہاریں" بیکاروں۔ ٹیکسوں اور محصولوں کا تذکرہ اپنے وقت کی کہانی ہے۔

اس دور کے تمام مضمون نگاروں کے اسلوب میں صفائی ہے وہ ادیب ہیں لیکن مبلغ اور واعظ زیادہ ہیں وہ دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانا اور انکو اپنا ہم رائے بنانا چاہتے ہیں۔

اس دور میں ایک شبلی ایسے ہیں جن کو مضمون نگار کی بجائے مقالہ نگار کہنا زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ ان کے تمام مقالے تاریخی و تنقیدی ہیں جو ان کی تحقیق اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا رنگ مضمون نگاری کے سلسلہ میں اودھ پنچ سے شروع ہوتا ہے جو ۱۸۷۷ء سے جاری ہوا اس اخبار نے اردو میں ظرافت نگاری کی بنیاد ڈالی اور مضامین کی خشکی اور روکھے پن کو ظرافت و مزاح سے دور کیا لیکن چونکہ اسکا مرکز لکھنؤ تھا اور لکھنؤ امراو رؤسا کے درباروں کی وجہ سے ہجو و پھبتی پھکڑ اور ضلع جگت کا اڈا بن چکا تھا اسلئے اودھ پنچ کے اہل قلم کی ظرافت میں لطافت نہ پیدا ہوسکی اور بعض اوقات ان کی باتیں نشتر بن گئیں لیکن اس کے باوجود ایک نئے رنگ کے پیدا کرنے کے احسان سے اردو مضمون نگاری ان اہل قلم کی ہمیشہ گراں بار رہے گی اودھ پنچ کے اڈیٹر نامور ادیب منشی سجاد حسین تھے اور دوسرے قلمی معاونین میں احمد علی شوق۔ جوالا پرشاد برق مرزا مچھو بیگ، منشی احمد علی کسمنڈوی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں دو مضمون نگار اور ہیں ایک چکبست دوسرے شرر۔ چکبست اپنے پیشہ وکالت کی وجہ سے مضمون نگاری کی طرف توجہ زیادہ نہ کرسکے ان کے چند مضامین

"مضامین چکبست" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ یہ زیادہ تر تنقیدی اور تاریخی ہیں۔ لیکن شرر میں ادبی صلاحیتیں کافی تھیں اور اودھ اخبار۔ محشر۔ دلگداز۔ تہذیب پردہ عصمت اتحاد۔ العرفان دل افروز ظریف وغیرہ رسائل ان کی صلاحیتوں کے نشو ونما میں اور معین ہو گئے چکبست کا طریقہ اظہار متانت کی طرف اور شرر کا شاعری کی طرف مائل تھا۔ شرر کا قلم معمولی موضوعات پر بھی خوب چلتا تھا وہ ایک پیدائشی مضمون نگار تھے۔

۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے الہلال طلوع ہوا۔ یہ مضمون نگاری کے لئے نوروز ہوگیا کیونکہ اس نے ایک نیا اسلوب پیدا کر دیا۔ اب سیاسی موضوعات بھی مضمون نگاری کا عنواں بن گئے مضامین کی زبان عالمانہ بن گئی جس میں عربیت اور فارسیت کا زور تھا غالب کی ترکیب تراشی تھی جس میں دقت نظر بھی تھی اور رنگینیٔ زبان بھی۔ انگریزی الفاظ کے ترجمے عربی الفاظ میں ہونے لگے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے لفظوں میں "ایڈیٹر کی جگہ مدیر مسئول۔ محرر خصوصی اور رئیس قلم تحریر۔ جریدہ کی جگہ مجلہ ولایتی ڈاک کی جگہ "برید فرنگ" "حیرت انگیز کی جگہ محیر العقول" قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں نئی تشبیہیں نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان ہر ہفتہ اس ادبی وعلمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے۔ حالی وشبلی کی سلاست وسادگی سر پیٹتی رہی اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اردو سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے"۔ اس اسلوب کو "ابو الکلامی اسلوب" کہنا بہتر ہوگا۔

جس طرح انگلستان میں سترھویں صدی میں مضمون نگاروں کے اندر ایک جماعت کردار نگاروں کی پیدا ہو گئی تھی جو مختلف انسانی کرداروں پر ظریفانہ رنگ میں لکھتے ہیں اسی طرح اردو میں کردار نگاری ظرافت کے ساتھ سجاد حیدر نے شروع کی ان کے بعد

دوسرے لوگوں نے اس رنگ کو اپنایا۔ پطرس بخاری عظیم بیگ چغتائی شوکت تھانوی۔
امتیاز علی تاج نے مختلف کرداروں پر تنقید کی۔ چونکہ کردار کی تحلیل نفسی عملی زندگی میں
واضح ہوتی ہے اسلئے یہ مضامین افسانہ نما بن گئے۔ کرداروں کی یہ تنقید بھی اردو میں
خاصی مقبول ہوئی۔

اس کتاب میں ہر رنگ اور ہر دور کے مضامین کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس سے
اندازہ ہو سکے کہ ہماری مضمون نگاری کن ادوار اور کن منازل سے گزر چکی ہے۔ ان
مضامین سے جہاں زبان کی ترقی مختلف اسالیب بیان نیز سماجی اور معاشی حالات کا
اندازہ ہوتا ہے وہاں انکے مطالعہ سے مضمون نگاروں کی شخصیت بھی نمایاں ہوتی ہے
اس کے الفاظ سے فقروں سے جملوں سے اور اس کے اسلوب سے۔ یہ قول صحیح ماننا
پڑتا ہے کہ اسٹائل خود شخصیت ہے، اس روشنی میں اگر مضامین کا مطالعہ کیا جائے گا
تو مضمون اور مضمون نگار دو الگ الگ چیزیں نہ رہیں گی بلکہ ان کی اصل ایک ہی رہے گی
مضامین کے عنوانات کو دیکھئے تو اس سے مضمون نگار کی پسند اور ناپسندیدگی محبت اور
نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ آئیے اس مسئلہ کو چند مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

مثال ۱

سرسید احمد خاں کے مضمون "اپنی مدد آپ" کا عنوان دیکھئے اور سرسید کی زندگی
کے حالات دیکھئے وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے ان کے لئے کوئی سہارا نہ تھا لیکن انکی
ذاتی محنت اور سوجھ بوجھ نے ان کو اسی مرتبہ پر پہنچایا جس پر کہ آج دنیا ان کو دیکھ رہی ہے
وہ خود ساختہ انسان تھے اور اپنی مدد آپ کا صحیح نمونہ۔

اسی مضمون میں جا بجا انگریزوں کی تعریف کے جملے اور پارے نظر آتے ہیں جس سے
ان کا رجحان مغربیت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

الناس علیٰ دین ملوکھم کی توجیہ ان کی عقلیت کا پتہ دیتی ہے۔

کردار کی تاثیر پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اس کو پڑھئے۔

"ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے۔ اس شخص کا اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اس کے ملک اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اسکی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ نسل کے لیئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔"

اس پارے کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرسید اور انکے حوارئین کا جائزہ لیجئے جو سب سرسید کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی مسٹر بک کی یہ تنقید بھی دیکھئے "سرسید کا دماغ بڑا تھا لیکن اس سے بڑا ان کا اخلاق تھا۔"

لالہ اشرفی مل (فرضی نام)، کا استہزا بھی خارج از علت نہیں ہے۔

مثال ۲۔

مولانا نذیر احمد کا مضمون کفایت شعاری دیکھئے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے تحریر کردہ حالات کو دیکھئے جو اُنھوں نے نذیر احمد کی کہانی کے عنوان سے لکھے ہیں مولانا نذیر احمد کی ابتدائی تعلیمی زندگی دیکھئے اور اس جملے کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ "وہ مولانا سود کو برا نہیں سمجھتے تھے" پھر کفایت شعاری کے سلسلے میں جو جزئیات لکھی ہیں وہ بھی بلا تجربہ کے نہیں لکھی جا سکتیں۔ گویا نذیر احمد کے الفاظ فرحت اللہ بیگ کے مرید ہیں

مثال ۳

مولانا ابو الکلام آزاد کے مضمون "جنگ کا اثر اخلاق پر" میں انکی زبان انکی علمیت کو بتا رہی ہے قرآن اور تاریخ اسلامی کے حوالے ان کے اسلامی جذبہ کو نمایاں کر رہے ہیں۔ زبان کی رنگینی ذوق شعر کا پتہ دے رہی ہے "ایک مدت کی غلامی کا افسردہ کن امن مفتوح قوموں کو فنا کر دیتا ہے" یہ جملہ انکی حریت پسندی اور احساس غلامی

کی چغلی کھا رہا ہے۔

اسی طرح اگر تمام مضامین کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو انمیں شخصیت کا ابھار اور نکھار واضح ہو جائے گا۔

مثال ۴

خواجہ حسن نظامی کا مضمون الو پر پڑھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خانقاہ میں کوئی صوفی بول رہا ہے۔ ہمہ اوست کی گونج سنائی دیتی ہے خیر و شر کا امتیاز مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش نظر ہے زاہدان شب بیدار کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

غرض مضامین کوئی اصنام جامد نہیں ہیں بلکہ لفظوں کے ان مجموعوں میں اور جملوں کی اسکی ترتیب میں شخصیتیں بولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

موجودہ دور اردو ادب میں تنقیدی دور ہے۔ ناول افسانہ شعر سب تنقید میں مصروف ہیں پھر کچھ ان اصناف کے نقاد ہیں کچھ ان نقادوں کے نقاد ہیں غرض سارے ادبی ماحول پر تنقید کا گہرا سایہ ہے۔ لوگوں کی نگاہیں گہرائی تک پہنچنے کی عادی ہو رہی ہیں اور کسی چیز پر سطحی اور سرسری نظر ڈالنا شان علمیت کے خلاف سمجھا جا رہا ہے مضمون نگاری اس حیثیت سے بہت متاثر ہوئی ہے یہ ہلکا پھلکا ادب ہے تعلیمی اداروں میں صرف اسکا ذکر خیر ملتا ہے لیکن اچھے نمونے وہاں بھی کمیاب ہیں۔ اس مجموعہ میں حتی الامکان ایسے ہی مضامین کو جگہ دی گئی ہے جو ذہن کی ہلکی جنبش کا نتیجہ ہیں۔ تنقیدی۔ تاریخی فلسفیانہ معاشیاتی قسم کے مضامین بھی اردو میں کافی ہیں لیکن وہ سب عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہیں اور جن کے لئے مقالے کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے۔ مضمون نگاری کے لئے قوت مشاہدہ استقرا اور اظہار کافی ہیں۔

سید صفی مرتضیٰ
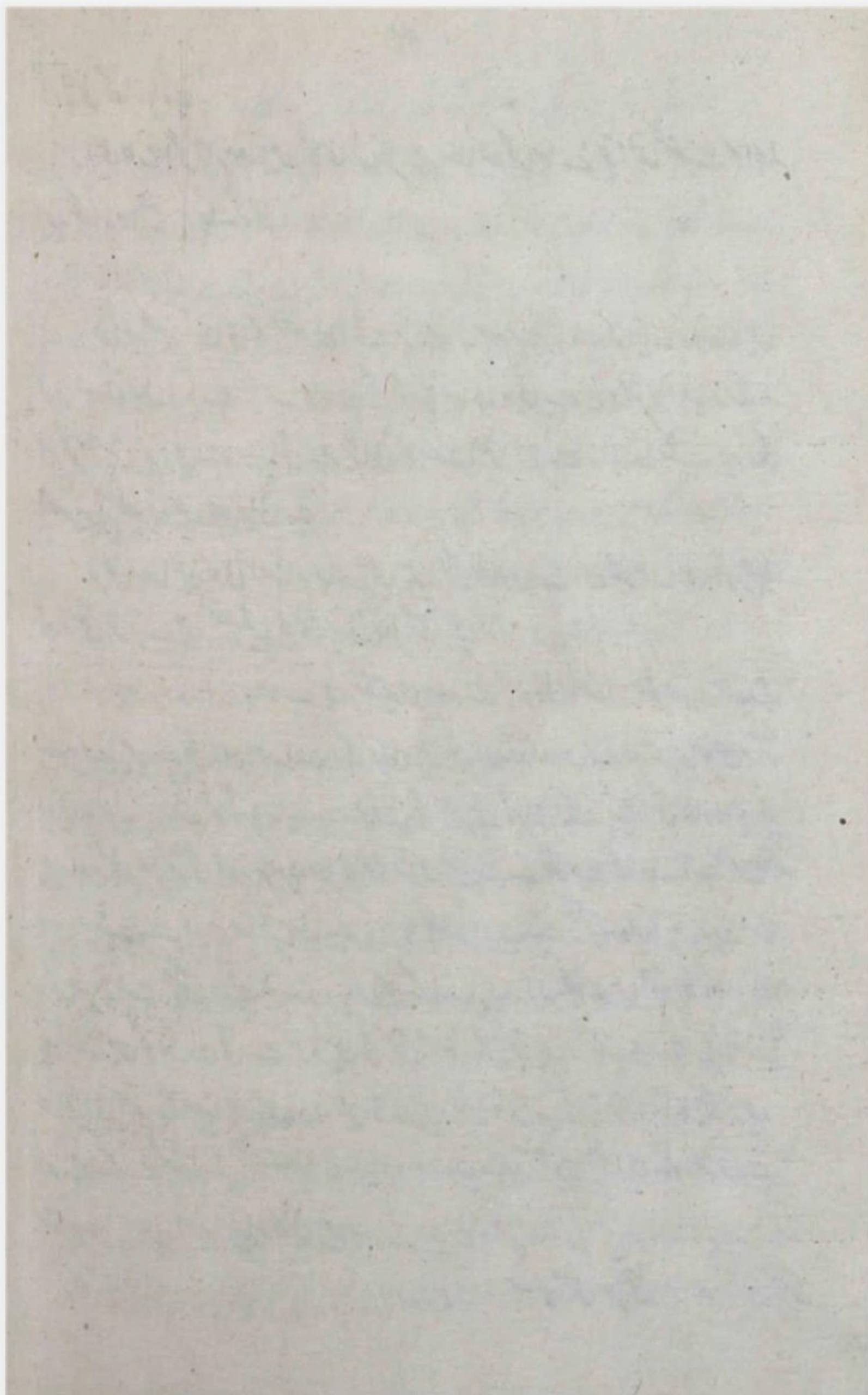
سرسید احمد خاں

سرسید پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو زبان میں مقالہ نگاری کی داغ بیل ڈالی ان کے مقالے زیادہ تر اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر ہیں چونکہ یہ موضوع خشک ہوتے ہیں اس لئے سرسید احمد کے مقالوں میں خشکی پائی جاتی ہے لیکن اظہار خیال میں روانی ملتی ہے۔ وہ قلم کی روانی میں گرامر کے اصول کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں اسلوب بیاں ہر موضوع کے مطابق اختیار کرتے ہیں کہیں شوخی وظرافت ہے تو کہیں سنجیدگی اور متانت۔ کہیں تاریخ سے سہارا لیتے ہیں تو کہیں منطقی استدلال سے لیکن جو کچھ لکھتے ہیں وہ ثبوت کے ساتھ۔ یہ مضامین اور مقالے تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے تھے جس کی ادارت کے فرائض بھی سرسید انجام دیتے تھے ذیل میں ان کا ایک مضمون " اپنی مدد آپ " درج کیا جاتا ہے۔

اپنی مدد آپ

"خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں"

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے جب کہ کسی شخص کے لیے یا کسی گروہ کے لیے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی مدد آپ کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اسکے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جب کہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں خواہ اپنی بھلائی اور ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (دیلمر بدیہی اور لابدی ہے) کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہم وطن بھائیو! کیا تمھارا یہی حال ہے۔

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا اور یہی سبب ہے کہ

یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کے ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جاوے قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دے دینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے بلکہ خود اس کے چال چلن پر اس کے برتاؤ پر بھی۔ اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قویٰ کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جب کہ قانون کا عمل درآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی فضول خرچ کو کفایت شعار، شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا بلکہ یہ باتیں شخصی محنت کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں قومی ترقی قومی عزت قومی اصلاح عمدہ عادتوں عمدہ چال چلن عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ درجہ حاصل کرنے سے۔

پرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ "الناس علیٰ دین ملوکھم" اگر اس مقولہ میں "الناس" سے چند خاص آدمی مراد لئے جائیں جو بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہوجاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔ رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے۔ نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب وشائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اس کو زبردستی سے نیچے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب وشائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھینچ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا۔ انگلستان کی رعایا تہذیب وشائستگی میں اس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی اس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا ہندوستان کی رعایا تہذیب وشائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھنچتی بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے۔

یہ ایک بیخبر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے یقینی اسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے جس طرح کہ پانی خود اپنی ہنسال میں آجاتا ہے اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل وخراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی وعمدگی اور قدر ومنزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن

اخلاق وعادات تہذیب وشائستگی پر منحصر ہے کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان افراد عورت اور بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی عزت۔ شخصی ایمانداری شخصی ہمدردی کا اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی شخصی بے عزتی شخصی بے ایمانی شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا ناتہذیبی وبدچلنی جو اخلاقی وتمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست ونابود کردیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہوجاویں گی جبتک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جاوے۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمھاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو کیا جو طریقہ تعلیم وتربیت کا بات چیت کا وضع ولباس کا سیر سپاٹے کا شغل اشتغال کا تمھاری اولاد کے لئے ہے اس سے ان کے شخصی چال چلن اخلاق وعادات نیکی وسچائی میں ترقی ہوسکتی ہے حاشا وکلا۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کرسکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح وترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اسکا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بداخلاقی خود غرضی جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی

ہمدردی سے بے پروا ہے وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا گو کیسی ہی تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ مرتبہ نہیں رکھتیں جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

مستقل اور مضبوط آزادی کچی عزت اصلی ترقی۔ شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن معاشرت و تمدن کا محافظ اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے جان اسٹیورٹ مل جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا و حکیم گزرا ہے اسکا قول ہے کہ "ظالم اور خودمختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح اور شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شے اس کے لئے ظالم اور خودمختار گورنمنٹ ہے پھر اس شے کو جس نام سے چاہو پکارو" اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ حکومت کیوں نہ قائم کی جاوے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اور اس اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اے مسلمان بھائیو کیا تمہاری یہی حالت نہیں ہے۔ تم نے اس عمدہ گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے کیا فائدہ اٹھایا ہے تمہاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے؟ ہیچ، ہیچ، ہیچ!

اس کا سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر علیٰ گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جائے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے حقیقت میں ایسا ہونا انسان کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالا اشرفی لال جو ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں۔

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی مدد آپ کرنا ہے جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے۔ اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے مخالف ہیں پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا جو ایک بڑا خیر خواہ آئرلینڈ کا تھا۔

اس نے کہا کہ جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کیلئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی قوتوں کو

ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی توقع یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے اگر ہم ایک دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام وخوشی وآزادی کی ہوجاوے گی۔"

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل درنسل کے کاموں سے حاصل ہوتی ہے محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے جوتنے والوں کانوں کے کھودنے والوں نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں آلات جر ثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں ہنرمندوں شاعروں حکیموں فلیسوفوں ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب وشائستگی کی عمارت کے معمار ہیں لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم وہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھے ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائداد ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جادیں مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی ہے اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ ان کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ عادل ہے یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے گو کسی لڑائی اور میدان کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں لیکن وہ فتوحات ان کو زیادہ تر انھیں مخفی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہیں عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوتے ہیں بہت سے ایسے اشخاص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر ان کا بھی ایسا ہی قومی اثر ہوا ہے جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے دگا ڈ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اس شخص کا اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اس کے ملک اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اسکی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے اور جب ہم اس عملی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسے اور مدرستہ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کے کام کا جس کو انگریزی میں "لائف ایجوکیشن" کہتے ہیں انسان پر قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرستہ العلوم کا

علم طاق میں یا صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں گھر کے رہنے سہنے میں شہر کی گلیوں کے پھرنے میں صرافہ کی دکان کرنے میں ہل جوتنے میں کپڑا بننے کے کارخانے میں اپنے ساتھ ہوتا ہے اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کئے لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے اسی پچھلے علم سے عمل چال چلن تعلیم نفس نفس کشی شخصی خوبی قومی مضبوطی قومی عزت حاصل ہوتی ہے یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجہ کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آجاتا علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے" اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

کیا یہی وجہ ہے جو مدرسۃ العلوم مسلمانان کے بانیوں نے یہ تجویز کی ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے گھروں سے اور بد صحبتوں سے علحدہ مدرسۃ العلوم میں عالموں اور اشرافوں اور تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت میں رکھے جاویں؟

مولوی ذکاء اللہ

دلّی کے رہنے والے تھے آزاد اور نذیر احمد کے ساتھیوں میں تھے نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے ریاضی۔ تاریخ ہیئت اخلاق اور ادب میں تصانیف یادگار چھوڑیں ادبی مضامین بھی لکھے بعض تخلیقی اور خود ان کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اور بعض انگریزی مضامین کے ترجمے ہیں موضوع کے لحاظ سے یہ مضامین اصلاحی بھی ہیں اور تخیلی بھی ان کے اسلوب میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے سنجیدگی اور متانت سے لکھتے ہیں بعض معمولی موضوعوں پر اچھے مضامین لکھے ہیں ذیل میں ان کا ایک مضمون گھر کی تربیت درج کیا جاتا ہے جو کسی حد تک انگریزی سے ماخوذ ہے۔

گھر کی تربیت

گھر ہی میں آدمی اخلاق کی تعلیم پاتا ہے۔ بری خواہ بھلی۔ گھر ہی میں آدمی چال چلن کے وہ اصول سیکھتا ہے جو اس کے ساتھ ساری عمر رہتے ہیں جوانی اور پیری میں وہ انھیں پر چلتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی خصلت کی بڑی تعلیم گاہ گھر ہے۔

مشہور ہے کہ آدمی میں اوضاع و اطوار آدمیت پیدا کیا کرتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ آدمی میں آدمیت اس کا دماغ پیدا کرتا ہے مگر ان دونوں باتوں سے زیادہ سچ یہ بات ہے کہ آدمی میں آدمیت گھر پیدا کرتا ہے وہیں اس کی عقل پیدا ہوتی ہے گھر ہی کی ٹکسال میں خصلت کے کھوٹے کھرے سکے ڈھالے جاتے ہیں گھر ہی سے وہ اصول و مسائل پیدا ہوتے ہیں جو معاشرت انسانی پر حکومت کرتے ہیں۔ گھر ہی کی باتوں کا عکس قانون ہوتا ہے ننھے بچوں کی وہی ننھی ننھی رائیں بڑے ہونے پر جمہور انام کا دستور العمل بنتی ہیں

آدمی جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ نہایت ہی بے کس و بے بس ہوتا ہے اسکی کل پرورش و تربیت و تعلیم ان آدمیوں کے ذمہ ہے جو اس کے آس پاس ہوتے ہیں جس وقت سے وہ سانس لینے لگتا ہے اس کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

ابتدا میں بچے کی تعلیم اس طرح ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کی نقل اتارتا ہے عربی ضرب المثل ہے "انجیر کے درخت کو دیکھ کر انجیر کا درخت زیادہ پھل لاتا ہے" اور ہماری مثل ہے کہ "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" بس یہی حال بچوں کا ہے کہ وہ مثال کی تقلید سے تعلیم پاتے ہیں بڑی معلمہ مثال ہے۔ بچپنے کی خصلت آدمی کی خصلت کا مغز ہوتا ہے باقی اور تعلیم بالائی پوست ہے جس کے اندر وہ مغز رہتا ہے ایک شاعر کا قول کیا ہی سچ ہے کہ جس طرح صبح دن کو دکھاتی ہے ایسے ہی بچہ آدمی کا حال تبلاتا ہے

مثل مشہور ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" جو باتیں ولادت کے وقت ہماری طبیعت میں نفوذ کرتی ہیں وہی دیرپا اور ہمارے چال چلن کی محرک ہوتی ہیں۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک نئے عالم کی چوکھٹ پر قدم رکھتا ہے ہر چیز کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے پھر رفتہ رفتہ وہ چیزوں کو غور کی نظر سے مشاہدہ کرتا ہے اشیا کا باہم مقابلہ کرتا ہے ان کے تصورات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے ایک فاضل نے لکھا ہے کہ اٹھارہ اور بیس مہینے کی عمر کے درمیان اس کو مادی اشیا، اپنے قوائے خاص اور اپنے اور دوسروں کی فہم کا اتنا علم حاصل ہو جاتا ہے کہ باقی ساری عمر اس قدر نہیں ہوتا اس عمر میں علم کا جو خزانہ جمع ہوتا ہے اور اس کے دماغ میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ ایسے ضروری ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی طرح ملیامیٹ ہو جائیں تو پھر اس کو ایک ہفتہ جینا محال ہو جاتا ہے۔

یہ بچپن ہی کی کیفیت ہے کہ "دل سادہ برائے پر نقش آمادہ" جو چنگاری اول اس میں پڑتی ہے وہ اپنی روشنی دکھلاتی ہے خیالات جلد ذہن میں آجاتے ہیں اور دیر تک ذہن میں قائم رہتے ہیں۔ بچپن میں جو باتیں ساتھ ہوتی ہیں وہ اکثر اخیر عمر تک ساتھ رہتی ہیں۔ بچپن ہی میں خصلت کی تعلیم کی ترقی ہوتی جاتی ہے یعنی مزاج کی ارادے کی عادت کی جن پر آئندہ ساری عمر کی خوش دلی بہت کچھ منحصر ہے اگر کسی عالی دماغ حکیم کو روزانہ بے آرامیوں اور بد اخلاقیوں اور کمینہ پن کی حالت میں پھنسا دو تو وہ خود بہ خود وحشی پن کی طرف کھنچا چلا جائے گا پس جب عاقلوں کی یہ نوبت ہے تو بچہ کا کیا حال ہوگا جو بکس ہے اور موم کی طرح بہت آسانی سے نقش قبول کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔

جس گھر میں محبت کا اور آداب حقوق شرافت کا ذوق غالب ہے جس میں دل و دماغ دونوں عاقلانہ حکم چلاتے ہیں جس میں روزمرہ کے کاروبار زندگی میں دیانت امانت راستی موجود ہے جس میں عاقلانہ و مشفقانہ انتظام موجود ہے اس گھر میں یہ توقع ہو سکتی ہے کہ

اولاد تندرست وخوش دل نفع رساں ایسی پیدا ہو کہ جب اس کو قوت اپنے مربیوں
کے قدم بہ قدم چلنے کی حاصل ہو تو وہ نیک دلی کے طریقوں پر چلے اپنے نفس پر ضابط ہو
اور اپنے ہمسایوں کے آدمیوں کی بہبودی اور رفاہ عام میں معاون ہو۔ بچہ کی طبیعت
ڈھالنے کے لئے سب سے عمدہ سانچہ نمونہ ہے اگر کوئی چاہے کہ بچوں کی خصلتیں اچھی
ہوں تو ان کے سامنے اپنی خصلت کے اچھے نمونے پیش کرے۔

ہر بچہ کی آنکھوں کے سامنے جو نمونہ مستقل طور پر رہتا ہے وہ اس کی ماں ہے
سو معلموں کی برابر ایک اچھی ماں ہوتی ہے گھر میں وہ سارے دلوں میں اور ساری آنکھوں
کی مقناطیس ہوتی ہے اولاد ہمیشہ ماں کی پیرو ہوتی ہے مثال امر سے بہتر ہوتی ہے مثال
تعلیم بالعمل کو کہتے ہیں۔ امر زبانی حکم کو۔ مثال اپنی بے زبانی سے جو تعلیم کرتی ہے وہ
زبانی اوامر نہیں کرتے مثال بد کے روبرو عمدہ اوامر بہت ہی کم فائدہ دیتے ہیں مثال
کی پیروی کی جاتی ہے اوامر کی نہیں۔ جب امر برخلاف عمل کے ہوگا تو وہ بزدلانہ برائیاں
سکھائے گا بچے بھی اپنے ماں باپ کی اس بات کو سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کچھ اور
کرتے ہیں کچھ اور اگر کوئی واعظ کسی کا مال مار کر جیب میں رکھے اور دیانت کا وعظ کہے
تو کچھ اثر نہ ہوگا۔ گھر عورت کا دارالسلطنت ہوتا ہے اس میں سارے احکام اس کے
چلتے ہیں وہ اپنے بچوں کی ننھی ننھی رعیت پر حکم ناطق نافذ کرتی ہے۔ ہر چیز کے لئے
بچے اپنی آنکھوں کو اس کی طرف لگائے رہتے ہیں ہر وقت ان کے روبرو وہی مثال
اور نمونہ ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں اور نقل اتارتے ہیں گو اس کا علم خود انکو نہ ہوتا ہو
اسی واسطے بچوں کے چال چلن اور طور طریقہ پر ماں کا اثر بہ نسبت باپ کے زیادہ
ہوتا ہے گھروں میں ماں کا نیک مثال ہونا ایک بڑی نعمت ہے۔

ابتدائے عمر میں دل کے اندر جو خیالات جم جاتے ہیں ان کا حال ایسا ہوتا ہے
جیسے کہ کسی چھوٹے پودے کی چھال پر حروف کندہ کر دئے جائیں وہ درخت کے ساتھ

بڑھتے چلے جائیں گے گو وہ کیسے ہی ہلکے ہوں مگر مٹنے کے نہیں زمین پر بیج ڈالے جاتے ہیں تو کچھ مدت تک وہ اس میں پڑے رہتے ہیں پھر پھوٹتے ہیں اور بڑھتے ہیں حتیٰ کہ آخر کو وہی ہمارے عادات اور اعمال ہو جاتے ہیں۔

نسل انسانی کا ظاہری انتظام مہر مادری پر ہے جس کا اثر مدام اور عالمگیر ہے جب سے انسان پیدا ہوتا ہے اس کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ماں کی محبت کا اثر شروع ہوتا ہے۔ بچوں پر نیک ماؤں کا اثر عمر بھر رہتا ہے جب اولاد دنیا کے کام دھندوں جھگڑوں بکھیڑوں اور ترددات اور تفکرات میں پڑتی ہے اور تکلیفات اور مشکلات پیش آتی ہیں تو وہ صلاح و مشورے اور تسلی و تشفی کے لئے ماں ہی کی طرف رجوع کرتی ہے مثل مشہور ہے کہ مصیبت کے وقت ماں ہی یاد آتی ہے مائیں اپنے بچوں کے دلوں میں جو عمدہ اور پاکیزہ خیالات جما دیتی ہیں وہی بڑے ہونے کی صورت میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔

عورت سب معلموں سے زیادہ نرمی اور ملائمت سے تعلیم کرتی ہے مرد انسانیت کا دماغ ہے عورت اس کا دل ہے وہ اس کی قوت ہے یہ اس کا حسن زیب و زینت ہے مرد عقلی ہدایتیں کرتا ہے مگر عورت قلب کی درستی کرتی ہے جس سے خصلت سنورتی ہے مرد حافظہ کو پر کرتا ہے عورت دل کو پر کرتی ہے مرد جس بات کا یقین دلاتا ہے عورت اس کی محبت دلاتی ہے غرض عورت کی بدولت ہماری رسائی نیکی پر ہوتی ہے اگر کوئی عورت نیک اطوار کفایت شعار خوش مزاج پاکیزہ طبیعت کسی گھر کی سرپرست ہو تو سارے کنبہ کی زندگی خیر و عافیت سے بسر ہوگی اور وہاں آرام و چین نیکی اور خوشدلی طرح طرح سے اپنے جلوے دکھائے گی۔ اور وہاں مرد کے لئے بہت سے ہمراہی دل کے خوش کرنے والے موجود ہوں گے۔ دلوں کے لئے عبادت گاہ وہاں تیار رہے حادثات زمانہ سے بچنے کے لئے امن وہ ہے محنت و مشقت کے بعد آرامگاہ ہے

مصیبت و افلاس میں تسلی و تشفی وہاں ہے غرض ہر درد کی دوا وہاں موجود ہے اور ہر وقت خوشی اور راحت کا ساماں مہیا ہے۔

بچوں اور بڑوں کی تربیت اخلاق میں گھر جیسا سب مدرسوں سے بہتر ہے ویسا ہی بدتر بھی ہو سکتا ہے گھر میں اس قوت کا ہونا بھی ممکن ہے جو بچپن سے لیکر دم آخر تک بجد شرارت اور جہالت پیدا کرتی ہے ماؤں اور دائیوں کی نالائقی سے کیا کیا اخلاقی آفات اور امراض ظہور میں آتے ہیں بچہ کو ایک پاجی جاہل دایہ کے حوالہ کردو تو بچہ میں وہ عیب ہوگا جو ساری عمر کی تقلید و تربیت سے دور نہ ہوگا جس گھر میں ماں شریر کاہل نابکار ہو کھڑپینچیں نکالتی ہو جھنجھلاتی ہو رنج پھیلاتی ہو وہ گھر جہنم ہے جس سے بھاگنے کو دل چاہتا ہے جن بچوں کی بدنصیبی سے ایسے گھروں میں پرورش ہو وہ اخلاق کی رو سے بودے اور بے ڈول ہوتے ہیں وہ نہ اپنے لئے اچھے ہوں گے اور نہ اوروں کے لئے بلکہ سب کے واسطے برے ہوں گے۔

مردوں کی خصلت بنانے میں جو اثر عورتیں کرتی ہیں گو نوشت و خواند میں نہ آئے مگر وہ ان کے بعد باقی رہتا ہے اور ہمیشہ اپنے نتائج خیر کو جاری رکھتا ہے عورتوں نے نہ تو بڑھ بڑھ کر تصویریں بنائیں نہ بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں نہ الجبرا ایجاد کیا نہ دوربین اور دخانی کلیں اختراع کیں بلکہ صاف باطن و نیک صفات اہل دل موجدوں کو اپنی گود میں تعلیم و تربیت کیا ہے اس سے بہتر کیا ایجاد دنیا میں ہو سکتی ہے اگر عورت اور مردوں کی خصلتوں کا فیصلہ اس لحاظ سے کیا جائے کہ کس نے زیادہ بھلائی دنیا میں پھیلائی تو عورتوں کو ترجیح رہے گی۔

عورتوں پر لازم آتا ہے کہ وہ سلیقہ مندی کی عادت پیدا کریں کہ جس سے وہ دنیا کے کاموں میں مؤثر مددگار معاون ہوں۔ عورتیں ہی بچوں کو دودھ پلانے والی تعلیم کرنے والی ہوتی ہیں ماؤں کی فقط محبت طبعی کافی نہیں عقل حیوانی نسل حیوانی کو قائم

رکھتی ہے کیونکہ اسکو ضرورت تعلیم و تربیت کی نہیں ہوتی لیکن عقل انسانی کی ضرورت ہمیشہ کنبہ میں رہتی ہے۔ جو تعلیم کی محتاج ہے خدائے تعالیٰ نے ایک خاص فطرت جسمانی عطا کی ہے لیکن اسکے ساتھ فطرت عقلی اور فطرت اخلاقی بھی سکونت پذیر ہے پس عورتوں کو سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ صحت جسمانی اور صحت عقل و صحت اخلاقی موجب قوانین فطرت گھر میں کیونکر حاصل ہوسکتی ہے؟ آدمی کے ایک تہائی بچے پانچ سال کی عمر کے اندر مر جاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ مائیں قوانین فطرت سے آگاہ نہیں ہوتیں وہ جسم کی ترکیب سے بے خبر ہیں تازی ہوا اور صاف پانی کے فوائد سے ناواقف ہیں زود ہضم غذا کے تیار کرنے کو نہیں سمجھتیں یہ بالکل سچ ہے کہ عورتوں کو مردوں جیسی عقل اس لئے دی گئی ہے کہ وہ کام میں لائی جائے نہ یہ کہ نکمی رکھ کر سڑائی جائے یہ عطیات بغیر کسی مطلب اور بقتضا کے نہیں عطا ہوئے۔

عورت اس لئے نہیں بنائی گئی ہے کہ وہ بے عقل اور نافہم رہ کر مرد کی خدمت یا مزدوری کرے یا ایک سہانا کھلونا بن کر وقت فرصت اس کا دل خوش کرے اسکے ذمہ ایسے نازک جواب دہی کے فرائض ہیں کہ جن کے لئے دماغ تعلیم یافتہ اور شفقت انگیز چاہئے عورتوں کی تعلیم کے باب میں ہمیشہ اختلاف رائے چلا آتا ہے ایک طرف تنگ دلی سے یہ رائے نامعقول بیہودہ ظاہر کی جاتی ہے کہ عورتوں کو علم کیمسٹری کا اتنا آنا کافی ہے کہ وہ ہنڈیاں پکائیں اور علم جغرافیہ اتنا بہت ہے کہ وہ اپنے گھر کے کمرے کو جانتی ہوں بڑا کتب خانہ ان کے لئے یہ ہے کہ ایک کتاب مقدس ان کے پاس ہو دوسری طرف اس کے مخالف وہ رائے ہے جس میں مبالغہ لغو فضول فطرت کی مخالفت موجود ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ تعلیم میں عورت اور مرد دونوں ہم پلہ ہوں حقوق اور رائے دینے میں دونوں برابر ہیں منصب و جاہ و دولت و حکومت کے لئے جو خود غرضی کی جڑ اور خطرے کا گھر ہے دونوں مساوی سمجھے جائیں فقط عورت ہونے کی وجہ سے

کسی جاہ و منصب سے محرومی نہ ہو۔

ابتداء عمر میں جو تعلیم و تادیب نہایت مناسب لڑکوں کے واسطے ہے وہی لڑکیوں کے لئے ہے تعلیم و تربیت کی جو استعداد مردوں میں ہے ویسی ہی عورتوں میں ہے مردوں کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے حق میں جو دلائل متین اور براہین عظیم بیان کئے جاتے ہیں وہی عورتوں کے اعلیٰ درجہ درجہ کی تعلیم کیلئے نہایت متانت سے وکالت کر رہے ہیں گھر کے تمام کارخانوں میں عقلمندی عورتوں کی بکارآمد اور موثر ہونے کو زیادہ کردیگی یہ عقلمندی عورتوں میں تفکر اور مآل اندیشی پیدا کریگی وہ پہلے انکو سمجھادے گی کہ زندگی کی ضروریات کیا ہیں اور وہ کیونکر بہم پہنچ سکتی ہیں غرض ہر طرح سے ان کو تقویت کا سبب ہوگی ان کو قوائے عقلیہ کی تادیب سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ وہ جیسے اپنے بھولے پن اور جہالت سے دغا اور فریب اور توہمات کے جال میں پھنس جاتی ہیں نہ پھنسیں گی اور اخلاقی و مذہبی تربیت ان کا افتخار بڑھادے گی اور انمیں وہ سچی خوداعتمادی اور فرائض پروری کرے گی جو خانہ داری کے چین و آرام اور خورسندی کا سرچشمہ ہے۔

مردوں کے اخلاق اور دماغ کا صحیح رہنا عورتوں پر موقوف ہے اسلئے عورتوں کی تعلیم ایک قوی اور مہتم بالشان امر سمجھا جاتا ہے عورتوں کی پاکیزگی اخلاق اور عقلی تربیت مردوں کی اخلاقی خصلت اور عقلی قوت کی بڑی ملجا و ماویٰ ہیں جیسے یہ دونوں مل کر اپنے قویٰ کو کامل طور پر ظاہر کریں گے ویسا ہی قوم کا انتظام زیادہ عمدہ ہوگا اور برتری و اقبال مندی یقینی ہوگی۔

مولانا حالی

اردو زبان میں سوانح نگاری کی ابتدا کی۔ فن نقد کو ترقی دی۔ نئے نظریات اور اصول پیش کئے اردو زباں کو اپنی تصنیفات سے مالامال کیا۔ مقالات بھی لکھے جو سرسید کے علیگڈھ انسٹیٹوٹ اور تہذیب الاخلاق اور ملک کے دیگر رسائل میں شائع ہوئے جو اخلاقی اصلاحی تنقیدی اور مذہبی موضوعات پر مشتمل تھے ان کے اسلوب نگارش میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے بعض جگہ انگریزی کے الفاظ بے تکلف لکھ جاتے ہیں حالانکہ ان کے مترادف الفاظ اردو میں موجود ہیں وہ کانوں پر گراں گزرتے ہیں۔ لیکن ان کی ہر تحریر میں خلوص وصداقت کی روشنی موجود ہوتی ہے انداز میں ان کی طبیعت کی سادگی کھنچ کر آگئی ہے ذیل میں ایک تمثیلی مضمون "زباں گویا" کے عنوان سے دیا جاتا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے جملے نشتر چھپائے ہوئے ہیں خطابی انداز نے اس کی تاثیر میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

زبان گویا

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیاں! اے میری قاصد! اے میری ترجماں! اے میری وکیل! اے میری زباں! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی نہ دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زباں ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی تو وہی زباں ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زباں! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کو بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سے سیکھا کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھ ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زباں ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں ہمارے سینکڑوں اور ہزاروں فائدے ہماری عزت ہماری ذلت ہماری نیک نامی ہماری بدنامی ہمارا سچ ہمارا جھوٹ صرف تیری ایک "ہاں" اور "نہیں" پر موقوف ہے تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے۔

اے زباں تو دیکھنے میں ایک پارہ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونہ قدرت الہٰی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کر اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا تو دل کی امیں ہے اور روح کی ایلچی دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشئے نہ چڑھا۔

اے زباں! تیرا منصب بہت اعلیٰ ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانہ غیبی ہے اور دل اسکا خزانچی حوصلہ اسکا قفل اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا ورنہ یہ منصب اعلیٰ تجھ سے چھن جائیگا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھاوے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زباں ہے تو زباں ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیاں ہے اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زباں جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز کسی نے بدعہد بنایا اور کسی نے

غماز۔ غیبت اور بہتان مکر اور افترا طعن اور تشنیع گالی اور دشنام جھگڑا اور ضلع جگت اور پھبتی غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زباں یاد رکھ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العناں نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے چھوٹ نہ بلوائیں گے ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زباں ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور ان کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"۔

الٰہی اگر ہم کو رخصت گفتار ہے تو زباں راست گفتار دے اور دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زباں پر ہم کو اختیار دے جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ آمین

مولانا نذیر احمد

اردو زبان میں ناول نگاری شروع کی۔ اصلاح معاشرت اور دینی درد میں یہ ناول ظہور میں آئے دلّی کی زبان لکھتے ہیں خصوصاً دلّی کی عورتوں کی زبان لکھنے میں کمال حاصل ہے قلم میں وہ روانی ہے کہ جب چل پڑتا ہے تو لکھتا چلا جاتا ہے زبان میں روزمرہ اور محاورہ کا لحاظ رکھتے ہیں مضامین بھی لکھے لیکن معیاری ادب نہیں کہے جاسکتے اسکولوں کی درسیات میں معلوماتی حیثیت ضرور رکھتے ہیں ذیل میں ایک مضمون "کفایت شعاری" لکھا جاتا ہے جس سے انداز قلم کے ساتھ میلان طبع کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کفایت شعاری

فارغ البالی کے زمانہ میں آئندہ کے واسطے فراہم کرنا پیش بینی ہے اور یہ
ایک صفت محمود ہے اس لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ خرچ آمدنی سے زیادہ
نہ ہو بلکہ کچھ نہ کچھ ہمیشہ پس انداز ہوتا رہے اگر روزمرہ کا حساب قلم بند کیا جائے تو
خواہ مخواہ یہ معلوم ہو جائے گا کہ روپیہ کس طرح صرف ہوتا ہے اور ان میں ضروری اور
غیر ضروری مدات کیا ہیں اور جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آمدنی کیا ہے اور خرچ کیا۔
انسان ضرور فضول خرچی میں پڑ جائے گا آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ ضرور بچانا چاہیئے
(خواہ قلیل مقدار ہی میں کیوں نہ ہو) کیونکہ اس سے طبیعت کو خوشی پیدا ہوتی ہے
اور اطمینان حاصل رہتا ہے اور اگر آمدنی سے زیادہ ایک پائی بھی خرچ ہو جائے تو
جان لو کہ رفتہ رفتہ بربادی آنے والی ہے کیونکہ اس صورت میں قرض لینا پڑے گا
اور قرض بربادی کی جڑ ہے اگر آمدنی کم ہے تو خرچ کو بھی کم کر دینا ضروری ہے۔
ظاہری شان و شوکت کی حاجت نہیں۔ عمدہ کھانے اور عمدہ لباس کی ضرورت
نہیں خدمتگاروں کے بدلے خود اپنا کام کرنا گوارا۔ مگر قرض لینا کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا
جو شخص قرض لیتا ہے وہ ہمیشہ رنجیدہ رہتا ہے روکھی روٹی کھانا اس سے بہتر ہے کہ
قرض سے دسترخوان آراستہ کیا جائے اور یہی حقیقت میں قناعت ہے۔
کفایت شعاری ذریعہ مسرت بھی ہے لہذا نہ صرف یہ ضروری ہے کہ اکتساب معاش
کے وسیع وسائل اختیار کریں اور ان کو پوری طرح کام میں لائیں بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ
جو کچھ حاصل ہو اسکا کچھ حصہ بطور اندوختہ رکھیں کیونکہ جس قدر کمایا تھا اگرچہ وہ سب کا
سب خرچ کر دیا تو محنت اور کاہلی کا انجام ایک سا ہوا عقلمندی یہ ہے کہ مجبوری

اور بیکاری کے زمانہ کا خیال رکھا جائے اور اچانک ضرورتوں کے واسطے پیش بینی
سے کچھ نہ کچھ پس انداز کیا جائے۔
کفایت شعاری بہت سے تعیش سے بچاتی ہے اور انسان کو پرہیزگار بناتی ہے
اور اسکے ساتھ ہی بہت سی جائز خوشیاں بخشتی ہے یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ اگر زیادہ
رقم پس انداز نہیں ہوسکتی تو تھوڑی رقم کیا بچائیں "دانہ دانہ ہمی شود انبار" تھوڑا تھوڑا
جمع ہوکر معتدبہ رقم ہوجاتی ہے جو خاص کسی ضرورت کے وقت کچھ نہ کچھ کام آئے گی
کفایت شعاری کے لئے کسی زیادہ لیاقت کی ضرورت نہیں تھوڑا سا طبیعت پر قابو
ہونا چاہیئے کہ انسان محض دل بہلانے یا تھوڑی دیر کی واہ واہ کی خاطر غیر ضروری اخراجات
سے مجتنب رہے جب کفایت شعاری کی عادت پڑجاتی ہے اور کچھ روپیہ جمع ہوجاتا
ہے تو اس کے فوائد خود بخود نظر آنے لگتے ہیں حادثات زمانہ اور واقعات غیر اختیاری
کے وقت مصیبت کی گھڑیوں اور سخت ضرورتوں میں اپنا پیسہ بے منت کام آتا ہے
نہ کہ اوروں کی سخاوت اور فیاضی اول تو کوئی اس قسم کی مدد نہیں کرتا اور اگر کسی نے
کی بھی تو غیر مکتفی اور بہ ہزار منت۔
اگر کوشش بیکار جائے اور کچھ بھی پس انداز نہ ہوسکے تو بھی یہ سعی منفعت سے
خالی نہیں اگر کچھ بھی نہ ہوگا تو طبیعت میں احتیاط اور انضباط ہی پیدا ہوجائیگی فضولخرچی
کی عادت ہی چھٹ جائے گی بیہودہ مشاغل ہی سے نجات مل جائیگی بیہودہ جذبات
ہی رک جائیں گے کسی قدر افکار ہی ہلکے ہوجائیں گے اور طبیعت کو سکون نصیب ہوجائیگا
روپیہ پاس ہوتا ہے تو طبیعت میں عجب استغنا اور بے فکری کی کیفیت ہوتی ہے
اور بڑھاپے میں یا معذوری کے وقت عزت بنی رہتی ہے اور طبیعت کو بھی اطمینان
ہوتا ہے کہ اولاد ہمارے اندوختہ سے متمتع ہوگی۔ دنیا میں جس قدر تہذیب پھیلی وہ سب
کفایت شعاری اور اندوختہ کی بدولت ہے کیونکہ کفایت شعاری سے راس المال

حاصل ہوا اور راس المال سے اشیا پیدا کرنے کی قوت ہوئی۔

کفایت شعاری کی عادت بعض لوگوں میں قدرتی ہوتی ہے لیکن بہتوں کو اکتسابی طور پر حاصل کرنی پڑتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو آئندہ کی آسائش اور آرام کے لئے موجودہ وقت کی تھوڑی سی غیر ضروری خواہش کو روکنا پڑے یہی حال قوموں کا ہے جو قومیں اپنی تمام آمدنی خرچ کر ڈالتی ہیں اور کچھ نہیں بچاتیں انکے پاس بالکل راس المال نہیں ہوتا اور وہ ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے دوسروں کی دست نگر ہوتی ہیں ان میں افلاس اور مصیبت پھیل جاتی ہے اور بے مائگی کی وجہ سے وہ تجارت بھی نہیں کرسکتیں نہ ان کے پاس جہاز ہوتے ہیں نہ کشتیاں لیکن جو قومیں کفایت شعار ہیں وہ آج دنیا کی تہذیب کا چشمہ اور دولت کا مخزن بنی ہوئی ہیں۔

کسی ملک میں افلاس دو وجہوں سے پھیلتا ہے اول روپیہ کی احتیاج۔ دوم روپیہ کا بیجا صرف۔ بڑی وجہ بیجا صرف ہے روپیہ پیدا کرنا تو مشکل ہے لیکن اسکو سلیقہ سے خرچ کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے جو شخص اپنی قوت بازو سے اس قدر پیدا کرتا ہے کہ اس کی ضرورت کے لئے کافی ہو اور کچھ پس انداز ہو جائے تو یہ اندوختہ خواہ کتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو اس سے اس کی اور کل گھر کی معاشرت کی بہبودی پر بڑا اثر پڑتا ہے اور یہی اندوختہ اس کی آزادی کو قائم رکھتا ہے جس شخص کو خدا نے معمولی عقل دی ہے وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ روز کا روز صرف کر دینا عاقبت اندیشی کے بالکل خلاف ہے۔

جس شخص کو معمولی تنخواہ ملتی ہو یا جس کی آمدنی معقول ہو وہ مرتے وقت کچھ نہ چھوڑے اور اس کے بیوی بچے محتاج اور بے سہارا رہ جائیں یا ان کے سر پر متوفی کے قرضہ کا بار پڑے تو سوائے اس کے کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ ناعاقبت اندیش تھا یا اسقدر خود غرض تھا کہ اپنی خواہشوں کے پیدا کرنے کے مقابلہ میں اسے کسی بات کی پرواہ

ہی نہ تھی ایسے لوگ اپنی آزادی ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے ہیں اور نمائشی سامانوں کی فکر میں محتاج ہو جاتے ہیں پرہیزگاری آزادی دیانت داری خودداری وغیرہ کے اوصاف کفایت شعاری سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ ایسے اوصاف ہیں کہ جن پر انسان کے اخلاق کی بنیاد ہے اور خودداری کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان اپنی وضع کو نبھائے اور اپنا بار خود اٹھائے اور اسی میں اس کی عزت ہے اور اگر دوسروں پر اپنا بوجھ ڈالے گا تو حقیقی عزت و آرام سے نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر شخص کو اپنی حاجتوں کا جس قدر احساس ہوتا ہے دوسرے کو نہیں ہوتا اسی طرح اپنے دل کی محبت اپنے دل کی امید اور اپنی پسند کا اثر جس طرح خود اپنے اوپر ہوتا ہے دوسروں کو اس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی اس لئے ہر شریف شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی آئندہ حاجتوں کا خیال رکھے اور چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے۔ غربت عیب نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ افلاس بہت سے نیک کام نہیں ہونے دیتا اور اطمینان اور سکون خاطر کو برباد کر کے خوشیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔

کفایت شعاری کے اصول کچھ مشکل نہیں ہیں اور ہر شخص ان کو سمجھ سکتا ہے اور ذرا سے انتظام سے ان پر عمل کر سکتا ہے اول تو یہ کہ آمدنی کا تھوڑا سا حصہ (خواہ کتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو) آئندہ کی حاجتوں کے لئے جمع کیا جائے۔ دوم جو کچھ خریدا جائے اس کی قیمت نقد ادا کر دی جائے اور قرض کے بکھیڑے سے پرہیز کیا جائے۔ نیز یہ انتظام کیا جائے کہ کوئی چیز قرض لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ سوم جس کام میں روپیہ لگایا جائے پہلے اس کے نفع اور نقصان کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جس کا نفع یقینی نہ ہو اس میں روپیہ صرف نہ کیا جائے چہارم آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ پنجم جو چیز خریدی جائے اس کو احتیاط سے استعمال کیا جائے اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اپنی یا نوکروں کی غفلت سے خواہ مخواہ چیزیں ٹوٹ کر

خراب نہ ہوجائیں اور گھر کی چیزیں اس طرح فضول برباد نہ ہوتی رہیں کہ ہر وقت انکے خریدنے اور بنوانے کی ضرورت ہو بلکہ ہر شے سلیقہ سے استعمال ہو اور یہ کام گھر کے نوکر یا داروغہ کے ذمہ نہ ہو بلکہ خود صاحب خانہ کو (مرد ہو یا عورت) نگرانی کرنی چاہیے جو لوگ غلط اصول پر اپنا کام چلاتے ہیں وہ ناکام رہتے ہیں مثلاً جو لوگ دوسروں کی مدد پر بھروسہ رکھتے ہیں وہ اکثر ناکامیاب ہوتے ہیں جو لوگ اپنا مال واسباب ہمیشہ خراب و برباد کرتے رہتے ہیں ناکام رہتے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزادؔ

بقول مہدی افادی آقائے اردو تھے ہر قسم کی نثر لکھنے پر کامل قدرت رکھتے تھے اسکولوں کی درسیات سے لے کر اعلیٰ ادبی کتابوں تک انکی انشاپردازی ہر شعبہ میں گل افشانیاں کرتی نظر آتی ہے مضامین کے سلسلہ میں نیرنگ خیال کے مضامین پیش کئے جاسکتے ہیں جس میں خیالی اور تمثیلی مضامین رمزیہ انداز میں لکھے ہیں۔ یہ انگریزی انشا کا چربہ ہے انگریزی میں سوئفٹ اور جان بینن نے اس قسم کے مضامین لکھے یہ رمزیہ انداز اردو میں آزاد سے شروع ہوکر آزاد ہی پر ختم ہوگیا۔ اگرچہ بعض ادیبوں نے کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ذیل میں آزاد کا ایک مضمون "گلشن امید کی بہار" لکھا جاتا ہے جو سادہ رنگین نثر کی بہترین مثال ہے۔

گلشن امید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع واقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں مگر یہ زمین جس قدر تخم امید کو پرورش کرتی ہے اس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی اور اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کرا ٹھتی ہیں یا بہ مقتضائے سن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں مگر امید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالت موجودہ ہماری کچھ خوشحال یا بدحال بھی ہوسکتی ہے اسیوقت سے اس کی تاثیر شروع ہوجاتی ہے۔ اُمید ایک رفیق ہم دم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانہ میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینہ کو پھیلاتا ہے خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوشحالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو خدائی کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہوجائیں پھر بھی یہ جادو نگار مصور ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہوجائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہوجائیں گی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہوجائے گا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ امید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے مفلسی بیماری قید مسافرت بہت سے دنیا کے دکھ درد ہیں کہ امید نہ ہو تو ہرگز نہ جھیلے جائیں "آس لاجئے نراس مرے" یہ نعمت جو بہ ظاہر ہر کس و ناکس میں عام ہورہی ہے وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کرسکتی کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم گزارنا مشکل ہوجائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے۔

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار   پر امید وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

اس میں شک نہیں کہ امید دھوکے بہت دیتی ہے اور ان باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہو سکتیں مگر وہ دھوکے اصل نعمتوں سے سوا مزا دیتے ہیں، اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں اگر کسی معاملہ میں ناکام بھی کرتی ہے تو اسے ناکامی نہیں کہتی بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے میں ایک رات انہی خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے۔ اور زمانہ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لئے امید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے۔ یکایک آنکھ لگ گئی دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نو بہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین و شاداب ہے ہر چمن رنگ روپ کی دھوپ سے چمکتا خوشبو سے مہکتا نظر آتا ہے زمین فصل بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہو گیا جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دلکشا کو نظر غور سے دیکھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو۔ پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھل مل جھل مل کر رہے ہیں اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں چاروں طرف ہرے بھرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں مگر پھر یہاں سے جو نظر اٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت

جھوم رہے ہیں ان کے تیار سیوے زمیں کو چوم رہے ہیں اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا چنانچہ قدم اٹھایا مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیراں ہوتا گیا کیونکہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی پاس پہنچکر اسکی رنگت پھیکی پڑگئی اور سیوے تو گرہی چکے تھے بلبلیں جو چہچہا رہی تھیں وہ آگے اڑتی چلی جاتی تھیں اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا اور جو بہاریں تھیں وہ بھی ہر قدم سامنے ہی تھیں مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں گویا میرے شوق آرزو کو ڈہکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دم بدم غمگیں ہوتے ہوتے میں دق ہوگیا تھا مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلے چلو یہ نعمتیں ڈہکا رہی ہیں کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آئیں گی آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا کہ جس میں زن و مرد خرد و کلاں بہت سے آدمی اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے منہ پر یقین کا رنگ چمک رہا ہے اور ایک ایک کی آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ خاص قسم کی ہے کہ وہ اسی کے دل میں ہے سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا بہت لوگوں کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزو مند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو تو انھیں اس کے بجھانے کی بھی فرصت نہیں اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا کیا آخر ایک بڈھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انہی میں شامل تھا ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ ہو نہ سکتا تھا میں نے خیال کیا کہ بڈھے کو اب کیا ہوس ہوگی اسے تو شاید جواب دینے کی فرصت ہو چنانچہ اسے سلام کیا بڈھے نے تیوری بدل کر منھ

پھیر لیا اور کہا "صاحب دق نہ کیجئے۔ آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے وہ وقت آن پہنچا ہے اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہو جائے گا افلاس زدہ اور طالب روزگار بچارے ٹیکس اور محصولوں کے مارے آئے دن کی جاں کنی سے خلاص ہو جائیں گے بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں وہ بھی بازو ڈال کر آرام سے بیٹھ جائیں گے"

میں نے بڈھے کو اس کی خشکی دماغ کے حوالہ کیا اور وہیں ٹھہر گیا اتنے میں ایک شخص سامنے آیا جس کی ملائمت شکل اور آہستگی رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید یہ کچھ اخلاق سے پیش آئے مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے جھک کر ایک سلام کیا اور کہا "اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں کیونکہ ۲۰ برس سے میں ایک عہدہ کی امیدواری کر رہا تھا اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے میں نے اسے بھی چھوڑا اور ایک اور کو جا لیا وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی اس کے پیچھے ایک اور شخص کو دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا تھا اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی اسکے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا یعنی اگر کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے اور سرکار علم سے انعام کا امیدوار ہے جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے اب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے آگے بڑھو اور آپ دیکھو کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا وہ آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے اسے دیکھ کر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہیے چنانچہ معمولی سوال کا سبق اسے بھی سنایا وہ ہنسا اور کہا "صاحب جہاں آپ کھڑے ہیں یہ ملکہ امید کا باغ ہے وہ ملکہ آرزو کی

بیٹھی ہے ذرا سامنے دیکھو بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس چیزیں لئے کھڑی ہیں جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا یہ انہی کے اشاروں پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں" آنکھ اٹھا کر دیکھوں تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالیشان ہے اور اسکے صدر میں ایک پری جس کا گلزار جوانی عین بہار پر ہے سر تخت جلوہ گر ہے مسکراہٹ اسکے زیر لب پارے کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر تاج مرصع موتیوں کے ہار خلعت زرنگار کشتیوں میں چنے ہوئے آگے دھرے ہیں قسمت اور نصیب جہاں کی نعمتیں سجائے اس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں اور بہار زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے عیش مدام اور فرحت دوام سے چہرہ روشن ہے اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے اور اس بھروسہ پر ہر ایک نخرو ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا رستہ کے دونوں طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی مگر ہرے درختوں نے سایہ کیا ہوا۔ دیواریں لپی ہوئی دروازہ پر روشن حرفوں میں لکھا تھا قناعت کا آرام گھر بعضے تھکے ماندے ان میں چلے جاتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے رستہ والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت کے میدان ہار گئے۔

باغ امید کے دو دروازے

یہ دیکھ کر میں ایک ٹیلہ پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہنچ سکتی تھی اور اس جگھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا چال خوب خیال میں آتا تھا وہاں سے معلوم ہوا کہ باغ امید کے اندر جانے کے دو دروازے ہیں ایک داروغہ دانش کے اختیار میں ہے دوسرا داروغہ خیال کے تحت میں ہے داروغہ دانش ایک تندمزاج اور وسواسی ہے کہ جب تک بہت سے سوال اور الٹی سیدھی جھتیں نہیں کر لیتا تب تک قفل کی کنجی کو جنبش

نہیں دیتا مگر داروغہ خیال خلیق اور ملنسار شخص ہے وہ اپنا دروازہ کھلا ہی رکھتا ہے بلکہ جو اس کی حد میں آ جائے اس سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ پیش آتا ہے چنانچہ جو لوگ داروغہ دانش کی حجتوں سے گھبراتے تھے یا جنھیں اس نے جانے نہیں دیا تھا ان لوگوں کی بھیڑ اس کے دروازہ پر لگ رہی تھی داروغہ دانش کے دروازے سے ملکہ کی تخت گاہ خاص کو رستہ جاتا تھا مگر اس راہ کی زمین پھسلی سڑک پتھریلی رستے ایسے اینچ پینچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اسی کو کہتے ہیں جب کسی قسمت والے کو داروغہ سے اجازت مل جاتی تھی تو اس کٹھن گھاٹی میں دکھ بھرنے پڑتے تھے اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستہ کے اینچ پینچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے اور جو جو بچاؤ کے مقام تھے ان میں قدم قدم پر نشان کر لیتے تھے مگر پھر بھی اکثر ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں جن کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا بلکہ جہاں صاف سیدھا رستہ سمجھے ہوئے تھے وہاں کچھ ایسا تہلکہ پیش آتا تھا کہ یکایک تھم جانا پڑتا تھا ہزاروں الجھاؤں میں الجھتے تھے صدہا رپٹنوں میں رپٹتے تھے بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے تھے غرض ایسے ایسے خطرناک داردائیں اور ناکامی کے صدمے تھے کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھادے میں الٹے پھر آتے تھے بہتیرے رستہ میں غش کھا کر رہ جاتے تھے بعض بعض ایسے بھی تھے کہ ان کی استقلال سے راہ تھی وہ اس کی دستگیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہنچتے تھے ان میں اکثر ایسے ہوتے تھے جو صلہ کو دیکھ کر پچھتاتے تھے کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے بہت زیادہ تھی یہ تو کامیابی نہیں ہوئی حق تلفی ہوئی ہے باقی جو لوگ اخیر انعام لے کر پھرتے تھے ان کا انجام یہ ہوتا تھا کہ دانائی داروغہ دانش کی بی بی ملکہ کی مصاحب تھی وہ ان کا ہاتھ پکڑتی تھی اس کی رہنمائی سے وہ لوگ گوشہ قناعت میں جا بیٹھتے تھے

اے راہ امید کے مسافرو! چونکہ داروغہ دانش کی حجتیں اور ان کے رستہ کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں اس لئے میں نے داروغہ خیال کی طرف رخ کیا

یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی وہ یہاں سے سر تا پا نظر آتی تھی اور اپنے عجائب غرائب نایاب اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو برابر حسن طلب کے انداز دکھاتی تھی پھر بھی لطف یہ تھا کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوائیں جدا جدا انداز سے اشارہ ہی تھی جس سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو نگاہ مجھ پر ہے وہ کسی پر نہیں اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی امید نہیں اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا پہاڑ اس خیالی رستہ کی طرف سے ایسا ڈھلوان تھا کہ قدم ٹھہر نہ سکتا تھا کیونکہ دہمی باتوں میں پائداری کہاں؟ باوجود اس کے آمد و رفت کے نشان بہت کثرت سے تھے کیونکہ اس رستہ میں چلنے والے بہت ہیں اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا ساتھ اس کے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو رستہ میں نے پایا ہے وہ کسی کو ہاتھ ہی نہیں آیا۔

یہ بلا نصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے بعضے تو ایسے کلدار پر لگانے کی فکر میں تھے جن کی حرکت کبھی تھکے ہی نہیں بعضے کہتے تھے جو ہو سو ہو انہی قدموں چلے جاؤ بلا سے مرجاؤ یہ سب حکمتیں کرتے تھے اس پر بھی زمین سے اٹھ نہیں سکتے تھے اور اٹھے تو وہیں گر پڑے مگر یہاں پڑے تھے تاک ادھر ہی لگی تھی اور اس حال تباہ پر خود پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ان پر پڑے پڑے ہنستے تھے۔

اکثر خیال کے پیارے اور وہم کے بندے ایسے بھولے بھالے تھے جنھوں نے اس باغ میں اگرا وروں کی طرح چڑھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا یوں ہی ایک جگہ پڑ رہے تھے یہ مقام کاہل گھاٹی کہلاتا تھا اور ایک سنسان اور بے آزار موقع پر تھا مگر ملکہ یہاں سے بھی سامنے تھی یہ اسی یقین پر خوش پڑے تھے کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آیا

چاہتی ہیں اگرچہ اور لوگ ان وہمیوں کو احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے مگر انہیں کچھ پروا بھی نہ تھی بلکہ یہ غم غلط لوگ اس دعوے میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر نظرِ عنایت ہوگی۔

انہی بے پرواؤں میں میں بھی پڑا ابھرتا تھا ان میں اتنا لطف پایا کہ اگر کوئی بات کرے تو اس کا جواب دیتے تھے اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے اسی خیال میں یکایک نظر پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو دیو ڈراؤنی صورت بھیانک مورت اس گھاٹی میں چلے آتے ہیں مگر ان کی کسی کو خبر نہیں ایک کو تو میں جانتا تھا کہ غم ہے مگر دوسرا افلاس تھا ان کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاک سیاہ ہوگئے اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ ہوگیا دلوں پر خوف و ہراس چھا گیا لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلائے تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا اسی سے میں بھی چونک پڑا اور دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔
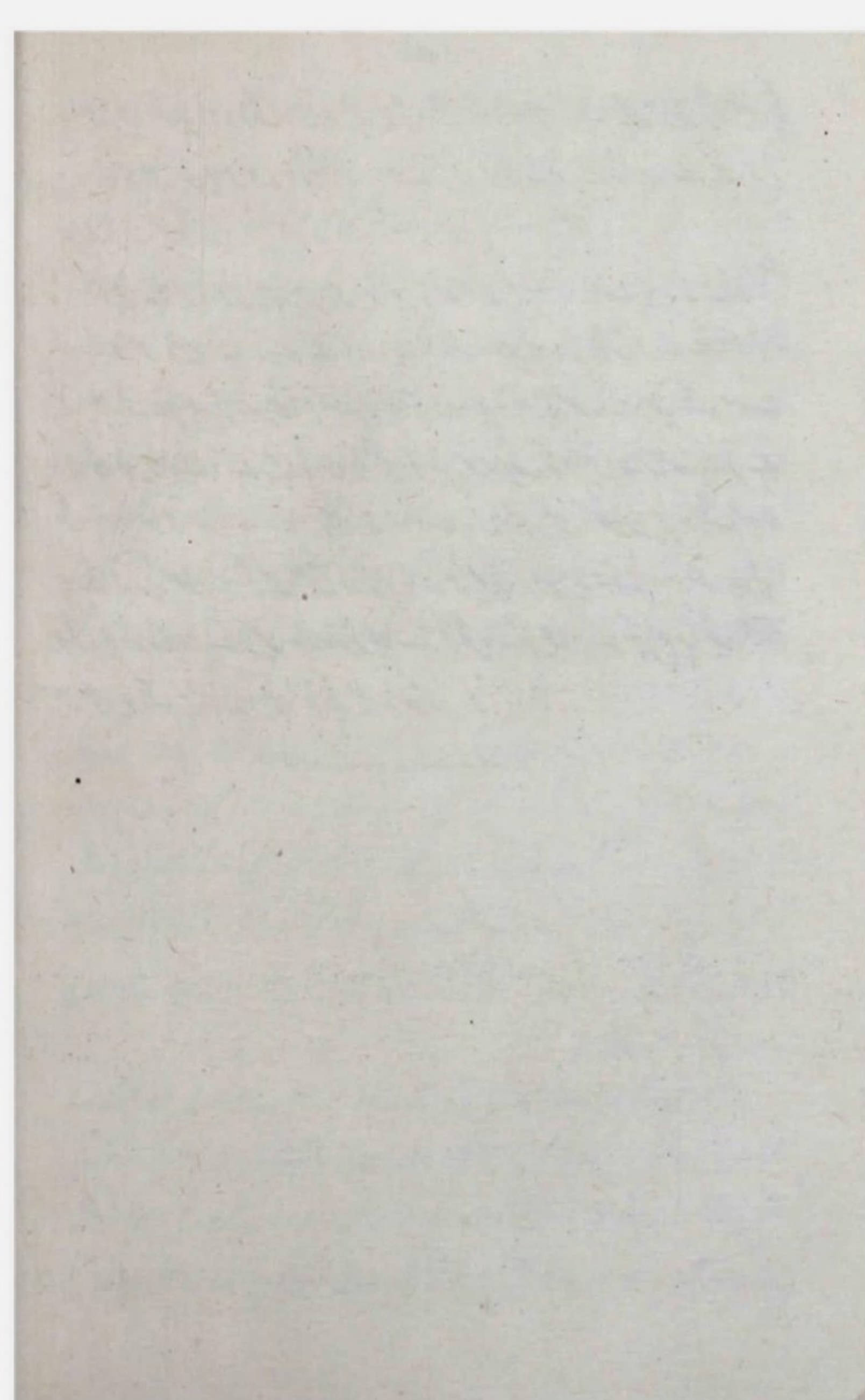
مولوی محمد اسماعیل میرٹھی

نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اُردو زباں کی کافی خدمت کی اردو قاعدہ سے لے کر دسویں جماعت تک کا نصاب تیار کیا جس میں اپنی نظمیں اور دوسرے شعرا کا مناسب انتخاب شامل کیا نثر میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ جماعتوں کی تدریجی ترقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے زباں میں بھی تدریجی ترقی دی کافی زمانہ تک ان کا تیار کردہ نصاب مدارس میں چلتا رہا اور مقبول رہا ذیل میں ان کا ایک مضمون "وقت سرمایہ ہے" لکھا جاتا ہے جس کی زبان سادہ صاف اور رواں ہے۔

وقت سرمایہ ہے

یہ وہ سرمایہ ہے جو ہر شخص کو قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے جو لوگ اس سرمایہ کو معقول طور سے کام میں لاتے ہیں وہی عیش جسمانی اور مسرت روحانی حاصل کرتے ہیں اس کی بدولت ایک وحشی آدمی مہذب انسان اور مہذب انسان ایک فرشتہ سیرت بن سکتا ہے اسی کی برکت سے جاہل عالم اور مفلس تونگر اور ناداں تجربہ کار ہو سکتا ہے اطمینان خوشی اور آرام انسان کو ہرگز میسر نہیں ہوتا جب تک وہ مناسب طریقہ سے صرف اوقات نہیں کرتا۔

وقت بے شک ایک دولت ہے جو کوئی اس دولت کو بے اندازہ و بے حساب خرچ کرتا ہے وہ روز بروز بے نوائی دست و مفلوک ہوتا جاتا ہے وہ جب تک زندہ رہتا ہے ہمیشہ رنجیدہ و پریشان اور زمانہ کا شاکی رہتا ہے موت بھی اس کو اس پشیمانی اور اندوہ سے نہیں چھڑا سکتی بلکہ اس کے حق میں موت کا آنا گویا مجرم کیلئے گرفتاری کا پروانہ ہے وہ جس طرح جیتے جی قسمت و تقدیر کو جھینکتا رہا اسی طرح مرنے کے بعد وقت گذشتہ اور عمر رفتہ کے حسرت و اندوہ میں مبتلا رہے گا۔

سچ یہ ہے کہ وقت ضائع کرنا بھی ایک طرح کی خودکشی ہے فرق اتنا ہے کہ خودکشی ہمیشہ کے لئے زندگی سے محروم کردیتی ہے اور تضیع اوقات ایک محدود زمانہ تک زندہ کو مردہ کردیتی ہے یہی منٹ گھنٹے اور دن جو غفلت اور بے کاری میں گزر جاتے ہیں اگر آدمی حساب کرے تو ان کی مقدار مہینوں بلکہ برسوں تک پہنچتی ہے اگر اس سے کہا جاتا کہ تیری عمر سے دس پانچ برس کم کردیے گئے تو یقیناً اس کو سخت صدمہ ہوتا لیکن وہ خود معطل بیٹھا ہوا اپنی عمر عزیز کو برباد کر رہا ہے اور اس کے زوال و فنا پر کچھ افسوس نہیں کرتا

اگرچہ وقت کا بیکار کھونا عمر کا کم کرتا ہے مگر ایک ہی نقصان ہوتا تو بھی چنداں غم نہ تھا کیونکہ دنیا میں سب کو عمر طویل نصیب نہیں ہوتی لیکن بہت بڑا زیاں وخسارہ جو بے کاری اور وقت ضائع کرنے سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بیکار آدمی کے خیالات ناپاک اور زبوں ہوجاتے ہیں طمع حرص ظلم حق تلفی نافرمانی اکثر وہی اشخاص کرتے ہیں جو معطل اور بے کار رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ کرنے کے واسطے بنایا گیا ہے جب اسکی طبیعت اور اسکا دل ودماغ نیک اور مفید کام میں مشغول نہیں ہوتا تو بالضرور اسکا میلان بدی اور معصیت کی طرف ہوجاتا ہے پس اگر آدمی آدمی بننا چاہتا ہے تو سب کاموں سے مقدم کام اس کے واسطے یہ ہے کہ اپنے وقت کا نگراں رہے ایک لمحہ فضول نہ کھوئے ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام مقرر رکھے۔

جو لوگ وقت کے پابند ہوتے ہیں وہ اپنے کام تن دہی اور جستی سے کرتے ہیں ان کو کام کے انجام دینے کا خیال لگا رہتا ہے کسی دوسرے کے تقاضے اور تاکید کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود ان کی طبیعت ان کو مجبور کرتی ہے کہ عین وقت پہ اور مقررہ مہلت کے اندر کام سے فراغت حاصل کر دیں یہ چستی ان کی خصلت اور عادت بن جاتی ہے اور بغیر اس طریقہ کارگزاری کے ان کو چین نہیں آتا۔

جب عین وقت پر کام کر لینے کی عادت پڑ جاتی ہے تو وقت میں بڑی وسعت و برکت معلوم ہوتی ہے اور ایک کام کے انصرام کے بعد دوسرے کام کے کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے ایسا شخص بہت سے کام انجام دے سکتا ہے پھر بھی اس کو سیر وتفریح کیلئے خواب وآرام کے لئے دوستوں کی ملاقات کے لئے فرصت مل جاتی ہے برخلاف اسکے جو آدمی وقت کے پابند نہیں ہوتے وہ کام کرنے میں سستی اور کاہلی کرتے ہیں اور اس خراب عادت کی وجہ سے وقت گزر جاتا اور کام بدستور باقی رہتا ہے اور جب

کام کرتے ہیں تو ان کو اپنا وقت کم اور کام زیادہ معلوم ہوتا ہے اس لیئے وہ اکثر تنگیٔ وقت سے نالاں رہتے ہیں اور عدیم الفرصتی کا گلہ کرتے ہیں اصل یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے وقت کو قطع و برید کر کے تنگ بنا لیتے ہیں۔

مشغلہ اور محنت میں خدا نے ایک یہ بھی برکت رکھی ہے کہ شاغل اور محنتی آدمی کے خیالات میں ہمیشہ نکوئی اور صلاحیت بڑھتی جاتی ہے وہ قانع سخی منصف دیانتدار شکرگزار اور باادب ہوتا ہے وہ اپنے اوقات کو بھی عزیز رکھتا ہے اور دوسروں کے اوقات میں بھی خلل انداز نہیں ہوتا اگر وہ کسی سے وقت معین کا وعدہ کر لیتا ہے تو اس وعدہ کو وفا بھی کرتا ہے وہ دوسروں کو انتظار کی تکلیف میں تا بہ مقدور نہیں ڈالتا۔

اب بیکاروں اور کاہلوں کے حالات پر غور کرو تو معاملہ بالعکس نظر آتا ہے نہ وہ اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں نہ دوسروں کے وقت کی۔ ان کے نزدیک وقت پر کام کرنا یا وعدہ وفا کرنا کوئی چیز نہیں وہ ریل پر سفر کرتے ہیں تو ایسے وقت اسٹیشن پر پہنچتے ہیں جب کہ روانگی کی سیٹی ہو چکتی ہے اگر ریلوے کے قواعد میں ان لوگوں کی رعایت بھی کی جاتی جو وقت کے پابند نہیں ہیں تو یہی ریل گاڑی جو گھنٹے میں تیس چالیس میل طے کرتی ہے چھکڑے سے بدتر ہو جاتی۔ میں نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ ایک ہمارے ہندوستانی امیرزادہ کو ریل کی سواری محض اس وجہ سے ناپسند تھی کہ اس میں وقت کی پابندی بہت ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم

مولانا حالی کے شاگرد اور ان کے ہم وطن اور ان کے فیض صحبت سے مستفید تھے سر سید کے پرائیوٹ سکریٹری اور مختلف اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ "وضع اصطلاحات" کے مصنف اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے آپ کا طرز تحریر نہایت سلیس اور معنی خیز ہے۔ کہیں کہیں جذبات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ عربی فارسی کے الفاظ سے گریز کرتے ہیں اور ہندی کے شیریں الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کا ایک مضمون "دوستوں کی ایذا رسانی" دیا جاتا ہے جس کا عنوان دلچسپ اور انوکھا ہے۔

دوستوں کی ایذا رسانی

آپ ذرا سوچیں اور غور کریں کہ دشمن کیسی ہی تکلیف پہنچانی چاہیں مگر وہ کسی کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا سکتے جب دشمنوں کی نسبت آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ دشمن ہیں تو آپ ضرور ان سے بچیں گے اور ان کے ملنے سے کترائیں گے اور انکی ایذارسانی کی کوششوں سے خبردار رہیں گے۔ دنیا کے لوگ بھی ان کو آپ کا دشمن جانیں گے اور ان کے طعنوں اور بدگوئیوں کی پرواہ نہیں کریں گے تو کیا یہ بات آسان نہیں ہے کہ آپ اپنے دشمنوں سے درگزر کریں اور ان کی خطا معاف کریں کیونکہ درحقیقت وہ کوئی بڑی ایذا آپ کو نہیں پہنچا سکے۔ اور نہیں پہنچا سکتے بڑی بات اور حقیقت میں تو بڑی بات یہ ہے کہ آپ اپنے دوستوں سے درگزر کریں اور ان کی خطا معاف کریں جب کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے دوستوں نے کس قدر نقصان آپ کو پہنچایا ہے اور کس قدر تکلیف ان کے سبب آپ کو اٹھانی پڑی ہے۔

اب ایک نوجوان کی طرف دیکھو اس نے عملی زندگی ابھی شروع کی ہے اسمیں ارادہ کی چستی اور ہمت کا جوش موجود ہے۔ وہ چاہتا ہے آگے بڑھے اور دنیا میں کامیابی اور ترقی حاصل کرے اگر کوئی دشمن حقارت کی نظر سے دیکھتا اور اس پر طعن کرتا ہے کہ یہ نوجوان بڑا پست ہمت اور بزدل ہے تو وہ اس کے طعنے یا تحقیر کی ذرا پرواہ نہیں کرتا بلکہ آگے بڑھتا اور ترقی کے میدان میں قدم مارتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ پست ہمتی اور بزدلی کا الزام اس پر آئندہ نہ آنے پائے۔ اب ذرا سوچو کہ دشمن کے طعنے اور تحقیر نے اس کو کس طرح کوشش اور سرگرمی پر اکسا دیا۔ اور کیونکر اس کے حوصلے کو بلند اور اس کی ہمت کو توانا کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے جو دشمن کی

ذات سے اسے حاصل ہوا وہ جو اس نوجوان کو ایذا پہنچاتا اور زمانہ آئندہ میں اسکو ترقی کرنے سے باز رکھتا اور اس کی امنگوں کو پست کرتا اور اس کی سرگرمیوں کو دھیما کرتا ہے اس کے دوست کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا جو اسکی مبالغہ آمیز تعریف کرتا اور اس کی وہ خوبیاں بیان کرتا ہے جو اس کی ذات میں موجود نہیں ہیں۔

نوجوان آدمی کسی صنعت میں مشغول ہو یا کسی کارخانہ میں کام کرتا ہو یا شاعر یا مضمون نگار ہو دوست اس سے ملنے کے لئے آتے ہیں اور مبالغہ آمیز تعریفوں سے اس کے کان بھرتے ہیں حالانکہ وہ تعریفوں کا اور ایسے دوستوں کا محتاج نہیں ہے جو مبالغہ کے طوفان اٹھائیں اور اس کی ذات میں وہ خوبیاں ثابت کر دکھائیں جو اس میں نہیں ہیں بلکہ وہ ایسے لوگوں کا حاجت مند ہے جو اس کے روبرو آکر کہیں کہ تم ابھی اس فن میں مبتدی ہو اگر کوشش نہ کروگے تو کبھی اس فن میں کامیاب نہیں ہو سکتے

افسوس ہے کہ وہ نوجوان دوستوں کے دھوکے میں آجاتا ہے اور ان کی باتوں کو صحیح جانتا ہے اور بجائے اس کے کہ کوشش اور سرگرمی کے میدان میں قدم بڑھائے پستی کے گڑھے میں اترنا شروع کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ دنیا کے عام لوگ اسکے ساتھ منصفانہ اور فیاضانہ طریقہ سے پیش نہیں آتے اور اس کے کمالات اور خوبیوں کا اقرار نہیں کرتے اور اس کے دوستوں کی طرح تعریف کے الفاظ زبان سے نہیں نکالتے اس طرح رفتہ رفتہ وہ تنزل کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ جس کام میں وہ مشغول ہوتا ہے اس میں ناکام رہتا ہے مگر اب ذرا خیال کیجئے کہ اس کی یہ ناکامی دشمنوں کی ایذا رسانی کا نتیجہ ہے یا دوستوں کی ایذا رسانی کا۔

گمان غالب ہے کہ جس نوجوان کے دوست نہ ہوں اور جو تنہا زندگی بسر کرنا اور اس زندگی کی مشکلات کو بذات خود حل کرنا چاہتا ہو وہ اکثر کامیاب ہو جاتا ہے۔
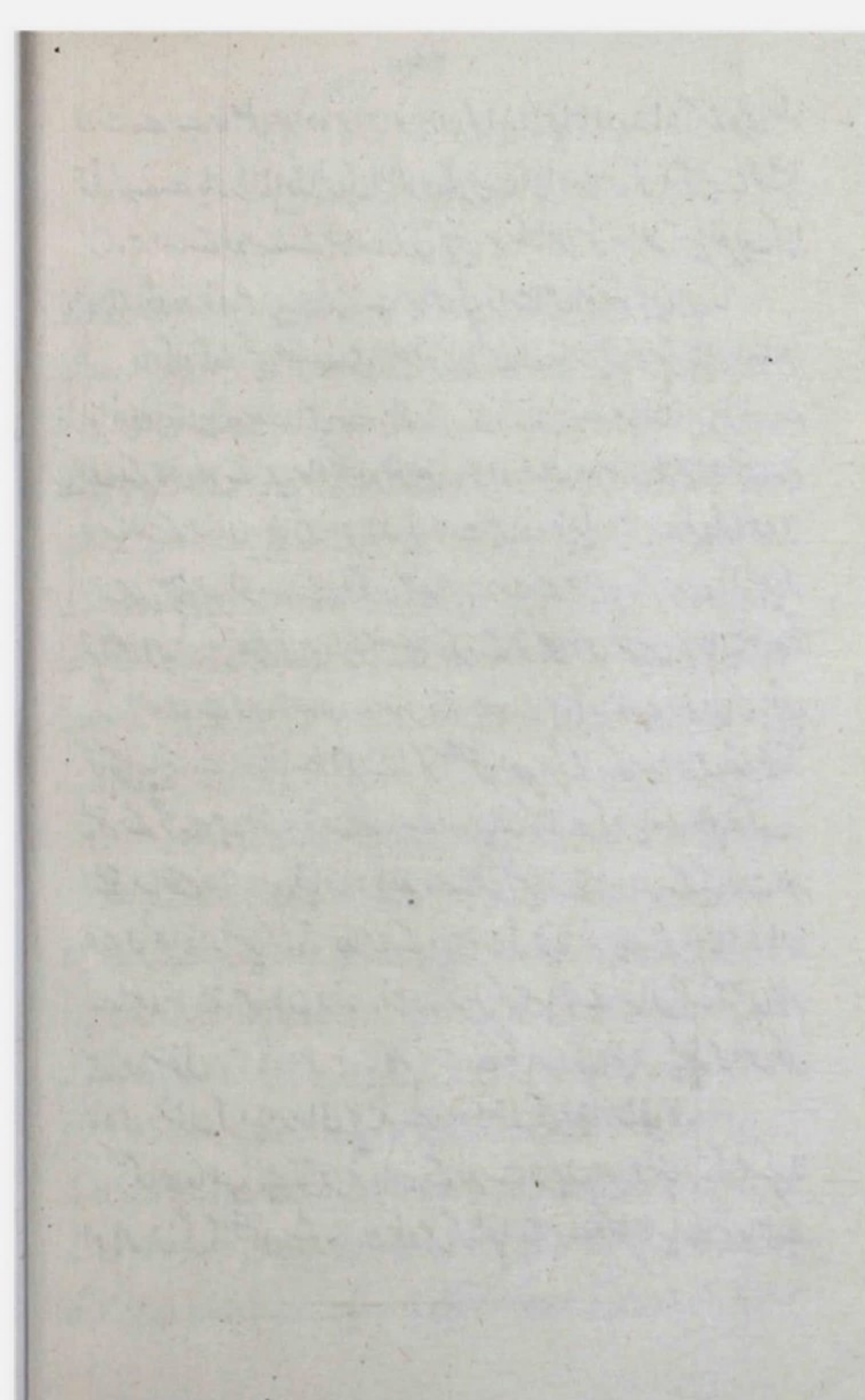
چکبست

اگرچہ انگریزی تعلیم یافتہ تھے لیکن اردو ادب کے فریفتہ تھے
مزاج میں متانت و سنجیدگی تھی یہی صفت ان کی شاعری اور انشا کی
خصوصیت ہے تحریر میں سلجھاؤ ہے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی وجہ
سے موضوع کی تنقیح خوب کرتے ہیں اور بحث و تمحیص میں متانت اور استدلال
سے کام لیتے ہیں۔ مبالغہ اور شدت پسندی سے دور ہیں انصاف پسندی
پائی جاتی ہے۔ انگریزی انشا کی سادگی ان کی تحریروں میں ملتی ہے انکے
موضوع چاہے نئے ہوں لیکن اسلوب قدیم ہے۔ جملوں کی ساخت انگریزی
نہیں ہے جیسا کہ بعض انگریزی داں مضمون نگاروں کا طرز ہے "اودھ پنچ"
کے متعلق ان کا ایک تاریخی مضمون ہے جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا انکے
مضامین مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں جو سب
یکجا کرکے "مضامین چکبست" کے نام سے مشہور ہیں یہاں اودھ پنچ کے
طویل مضمون کا اقتباس دیا جاتا ہے۔

اودھ پنچ

ہندوستان کے جس جس گوشہ میں اردو کا نغمہ سنائی دیتا ہے وہاں شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان اودھ پنچ مرحوم کے ذکر خیر سے آشنا نہ ہوں اودھ پنچ نے تیس پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردہ میں اخباروں کی دنیا میں سلطنت کی ہے اور اس کی پرانی جلدوں کے گورغریباں میں اکثر ایسے اہل کمال دفن ہیں جن کے قلم کی دھاک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔

جس وقت اودھ پنچ نے دنیا میں جنم لیا اس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا ۱۸۳۶ء میں پہلے پہل سرکار کی جانب سے ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی اور ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نے زبان اور ظرافت کے چہرہ سے نقاب اٹھائی اس چالیس سال کے عرصہ میں اردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے مثلاً لاہور میں اخبار عام اور کوہ نور کا دور تھا یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے دہلی میں اشرف الاخبار کی آواز سنائی دیتی تھی "وکٹوریہ پیپر" سیالکوٹ سے جاری تھا دکشف الاخبار، بمبئی میں اور جریدۂ روزگار، اردو کا نقارہ بجا رہا تھا کارنامہ اور اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے عرصہ ہوا کہ کارنامہ کا کام تمام ہو گیا اودھ اخبار ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھے ہوئے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے وہی جب تھا ان کے علاوہ اودھ پنچ کی اشاعت سے قبل بہت سے اردو اخبار اپنی پیدائش اور موت کی منزلیں طے کر چکے تھے مگر قابل غور بات یہ ہے

کہ یہ اخبار محض خبروں کی تجارت کرتے تھے بجز "لارنس گزٹ" کے جو کہ میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی عام طور سے ان اخباروں کا نہ کوئی خاص پولیٹیکل یا سوشل مسلک تھا نہ یہ کسی دستور العمل کے پابند تھے اردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اودھ پنچ اور "ہندوستانی" پہلے دو اخبار ہیں جنھوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا ہندوستانی کا دور اودھ پنچ کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولیٹیکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا انھی نے اسے بھی اپنی ذات کی طرح پولیٹیکل خدمت کے لیئے وقف کر دیا تھا اودھ پنچ گو ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولیٹیکل اور سوشل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا اس کا مستقل سوشل اور پولیٹیکل مسلک تھا اس صوبہ میں ہندوستانی کانگریس کا چراغ سمجھا جاتا تھا مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گزر نہ تھا وہاں اودھ پنچ کی بجلی چکاچوند پیدا کرتی تھی سوشل اصلاح کے معاملہ میں اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا نئی روشنی کے نادان دوستوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اس کی ذات سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہنچا ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً انڈین پنچ بمبئی پنچ بانکی پور پنچ وغیرہ اس کی تقلید میں نکلے مگر وہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کر ختم ہو گئے زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہیں ملی اودھ پنچ کا جادو اردو زبان پر عرصہ تک چلتا رہا۔ اور اس طولانی زمانہ میں جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور میں آئیں ان پر نظر ڈالنے سے اردو نویسی کے دربار میں ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہتے تھے جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم

اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے اردو نثر کے ان جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت اور رنگینی کے جوہر موجود ہیں وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہیں محض روزمرہ کی باتیں ہیں مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرہ پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر ہنستے ہیں ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجہ اعتدال سے گزر جاتی ہے اور انکے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مذاق سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں ایسا ہونا معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابل معافی ہے۔ اودھ پنچ کے ظریف اس زمانہ کی ہوا کھائے ہوئے تھے جب مذاق و بے تکلفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیاں ہماری نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے اور یہی دنیا کا دستور ہے۔ ممکن ہے کہ جن باتوں کو ہم آج پھول سمجھتے ہیں وہ آئندہ نسلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں۔ ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کر کے اودھ پنچ کی یادگار بہت

یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا اودھ پنچ کے پہلے رجب علی سرور کے طرز تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع اور بناوٹ کی طرف مائل تھا اس زمانہ میں جو اردو اخبار جاری تھے ان کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اردو کہہ سکتے ہیں آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے علاوہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف۔ حضرت احمد علی صاحب شوق پنڈت تربھون ناتھ ہجر نواب سید محمد آزاد بابو جوالا پرشاد برق منشی احمد علی کسمنڈوی حضرت اکبر حسین صاحب اکبر یادگار نام ہیں۔ ان لوگوں کے نظم و نثر کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک طرز تو کے موجد ہی نہیں ہیں بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہیں ان کی عبارت شوخی و تازگی اور خداداد بے تکلفی سے معمور ہے اور ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے نثر کے نامہ نگاروں میں طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے اور نیز زبان کی پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورے کی صفائی کے اعتبار سے ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلہ میں چوکھا ہے احمد علی صاحب شوق کے مضامین میں ظرافت کی شگوفہ کاری کے علاوہ زبان و محاورہ کی تحقیقات کا خاص لطف ہے۔ حضرت کسمنڈوی مرحوم کی عبارت خاص طور سے دلکش ہے مگر فارسیت کا رنگ زیادہ ہے ہجر کا رنگ خاص یہ ہے کہ ان کی ظرافت مقابلہ اوروں کے بدمذاقی اور طعن و تشنیع کے کانٹوں سے پاک ہے برق کی عبارت میں ظرافت کا چٹخارہ بہت کم ہے مگر زبان نہایت صاف اور ستھری ہے آزاد کا قلم نواب زادوں کی بے فکری و عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے میں مشاق ہے منشی سجاد حسین کا طرز تحریر سب سے الگ ہے مضمون کیا ہے چھوٹے چھوٹے

چٹکلوں اور لطیفوں کے ذخیرہ ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنف سے گفتگو کر رہا ہے عبارت کہیں کہیں مختلف علوم و فنون کے پیچیدہ استعاروں سے گراں بار نظر آتی ہے مگر بیان کی تازگی کی وجہ سے پڑھنے والے کا جی نہیں گھبراتا ظریفانہ نظم کے میدان میں حضرت اکبر سب سے دس قدم آگے ہیں۔ طبیعت کی خداداد شوخی اکثر زبان کی صفائی سے بازی لے جاتی ہے مگر عموماً سوشل پولیٹکل اور مذہبی مسائل کے ظرافت آمیز پہلو جس خوبی کے ساتھ حضرت اکبر نے نظم کئے ہیں وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ان کا معیار ظرافت بھی۔ اوروں کے مقابلہ میں لطیف تر ہے اودھ پنچ کی محفل انہی پرمذاق اور نورانی طبیعتوں سے آراستہ تھی اور اب بھی اگر کوئی شخص اردو زبان حاصل کرنا چاہے تو اودھ پنچ کے ٹوٹے کھنڈروں کی زیارت اس کے لئے ضروری ہے۔ اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو اسکے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی پرمذاق و دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرم چہلم عید شب برات ہولی دوالی بسنت کے جلسے عیش باغ کے میلے رقص و سرود کی محفلیں۔ مشاعرے عدالت کی روبکاریاں مرغ بازی تیتر بازی کے ہنگامے الکشن کے معرکے ایسے شغلے تھے جو ہمیشہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کی طبیعتوں کے لئے تازیانہ کا کام دیتے تھے۔ ساقی نامے بارہ ماسے دوہے ٹھمریاں غزلیں رباعیاں وغیرہ نظم کرنے میں اس کے اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین ہر ہفتہ ایک چھوٹا سا مضمون لوکل علیہ الرحمہ کے عنوان سے لکھتے تھے جس میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔

غرضکہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کر کے اودھ پنچ نے دنیا کو خیرباد کہا اسوقت اردو زبان میں بہت سے قابل قدر اخبار موجود ہیں مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے اور زمانہ کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہے گی مگر اردو زبان کی تاریخ میں یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدردانوں کے دلوں سے آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتی آج اودھ پنچ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں مگر اسکے تذکرے سے سخن سنجوں کی محفل خالی نہیں ؎

پھر گئے آنکھوں میں مشتاق گزشتہ نشہ میں
دور جام مے میں اکثر ذکر خیر جسم ہوا
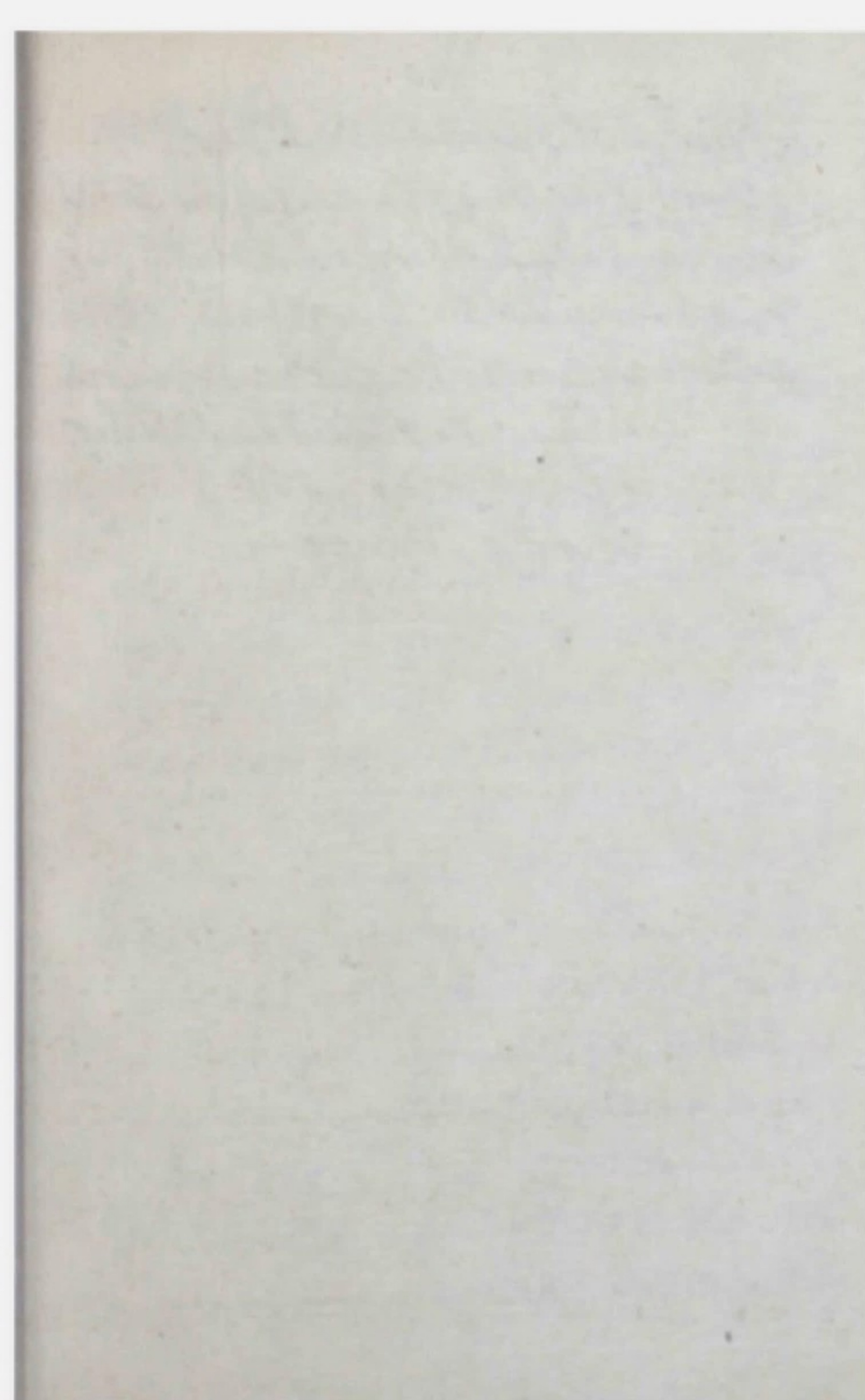
سید سجاد حسین

اودھ پنچ کے ایڈیٹر تھے مشہور ادیب اور ظرافت کار تھے اودھ پنچ کے صفحات اُن کی گل ریزیوں سے زعفراں زار بنے ہوئے تھے ان کا اخبار پنچ نامی تمام اخباروں کا سرتاج تھا۔ غیر متعصب شخص تھے مذہبی مضامین کو اپنے اخبار میں جگہ نہ دیتے تھے۔ مضمون پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن الفاظ کا خزانہ تھا اور ان کا تخیل ہمہ گیر۔ مضمون لکھتے وقت شاید چوک میں کھڑے ہوجاتے ہوں جہاں ہر چیز سے اپنے مضمون کا مواد حاصل کرتے۔

ہولی

اللہ اللہ ہولی کی فصل کیا آئی گویا اندھیری رات میں سرخ مہتابی چھوٹی ایک عالم بیر بہوٹی کی طرح سرخا سرخ ہوگیا ٹیسو پھولنے سے جنگل میں منگل ہورہا ہے سارا قطعہ کا قطعہ لال بھبوکا معلوم ہوتا ہے۔ باغ بغیچوں (باغیچوں) میں گل عباس گل اورنگ گل آفتابی گل شفتالو گلنار گل معصفر گل سرخ کھلے ہوئے الگ الگ اپنا جوبن دکھا رہے ہیں۔

آج کل زمانہ نے کچھ ایسا رنگ بدلا ہے کہ سبز کاہی زمردی دھانی زنگاری پستئی ماشئی بیگنی نافرمانی سرمئی اگرئی ملاگیری کاسنی خاکی صندلی بادامی فالسئی لاجوردی چینئی کاکریزی فیروزی طوسی خشخاشی کافوری جتنے رنگ تھے سب ایک سرے سے اڑ گئے اب جدھر نظر اٹھایئے گلنار گلابی زعفرانی آبی پیازی شربتی نارنجی قرمزی۔ سیندوری حنائی شجرفی لاکھی۔ عباسی کروندیا عنابی بنفشئی کے سوا اور کوئی رنگ نظر نہیں آتا۔

جوہریوں کی دکان میں پکھراج چنی مونگا لعل یاقوت کے سوا دوسری چیز کا بیوپار نہیں ہوتا۔ عطاروں کے یہاں شربت انار شربت عناب ہی کا آج کل خرچ ہے گندھی بھی صرف موتئے کا عطر اور حنا کا تیل بیچتے ہیں میوہ فروشوں کے پاس بھی نارنگیوں کو لوں و مریزیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کنجڑوں نے بھی فصل کی رعایت سے شلجم چقندر انگریزی بینگن لال مرچ کا سودا شروع کیا اس فصل میں اگر لڑکا بھی پیدا ہو تو لال خاں یا ہوری لال کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

یہ حضرت فصل کا تو بیان ہو چکا اب ذرا ہولی کی کیفیت سنئے رات کو سنا کہ

بارہ بجے ہولی جلے گی اب صبح کے انتظار میں پلک سے پلک آشنا نہیں ہوتی کروٹیں ہی کروٹیں بدلتے شب تیر کی کہ اتنے میں صبح کی توپ چل گئی دن سے گجر کی آواز کان میں آئی مرغ سحر نے ککڑوں کوں کی بانگ سنائی موذن نے اذان دی۔ شوالوں میں ارتی کے نقارے بجے سب کے سب چارپائیوں سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے اور آکے کارسپانڈنٹ نے سرگشتی شروع کی عجیب عجیب سیر دیکھنے میں آئی جس کو دیکھئے کام دھندے میں مصروف کہیں ٹیسو کے پھول مٹکائے جاتے ہیں کہیں پڑیا کا رنگ گھولا جاتا ہے کہیں پچکاروں کے گٹے بندھوائے جاتے ہیں کہیں دہلکوں کے کیل کانٹوں کی درستی ہو رہی ہے کہیں زعفران و مشک باہم کھرل کی جاتی ہیں کہیں سناروں کو چھوٹی چھوٹی طلائی و نقرئی پچکاریاں گنگا جمنی گلاب پاش ہزارے مرمت کو دیئے جاتے ہیں کہیں گاجروں کی بیندیاں کاٹ کر اچھے اچھے معقول فضلی خطاب لکھے جاتے ہیں کہیں پرانی دھرانی سڑی گلی لتریں (جوتیاں)، موری کی کیچڑ میں بھگوئی جاتی ہیں کہیں کاجل اور تیل کا غازہ تیار ہو رہا ہے کہیں گلال کے تھال چلے آتے ہیں کہیں عبیر کے واسطے بسنتو کمہار بھیجا جاتا ہے کہیں چھوٹے بڑے ٹوٹے ٹاٹے قمقمے طشتریوں پر علحدہ علحدہ چنے جاتے ہیں کہیں لونڈے لاڑی بانس کے ٹونٹوں کے پچکے بنا رہے ہیں کہیں یاقوتیاں تیار ہو رہی ہیں کہیں معجونیں بن رہی ہیں کہیں رنگین برفی کی قتلیاں کاٹی جاتی ہیں۔

کہیں باری بیٹھے دونے بنا رہے ہیں کہیں کھجوروں کے واسطے میٹھے پیسے جلتے ہیں کہیں برے دہی میں بھگوئے جاتے ہیں کہیں گھی میں پاپڑ تلے جاتے ہیں۔ کہیں تکونوں میں مٹر کی پھلیاں اور آلو بھرے جاتے ہیں کہیں گرم گرم پوریاں کڑاہی سے نکل رہی ہیں کہیں چھنن من کلیجی بھن رہی ہے کہیں کمہاروں کے ہاں کے کلھڑ اور چپنیاں منگائی جاتی ہیں خلاصہ یہ کہ دعوت کی تدبیریں ہو رہی ہیں اب دس بجے ہوں گے کہ

لالہ بھائی بنئے مہاجن وغیرہ پوشاک تبدیل کر کے کئی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے کبھی اس
محلہ میں جا نکلے مسرت اور شادمانی کے نشہ میں چور جھولیوں میں عبیر و گلال بھرے ہوئے
رنگ کے مٹکے ساتھ ساتھ سر سے پاؤں تک شرابور قہقہے اڑاتے چلے جاتے ہیں۔
کہ لالہ بسنت رائے محافظ دفتر کے گھر پہنچے انھوں نے ان کے منہ میں جھبیر جھونکی گالیوں
کی تھوڑی دیر بوچھاڑ ہو گئی آخر کار سب ٹھکانے سے بیٹھے چلیں رو بدر کھی گئیں
بھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے ہر ایک اپنے دل کا غبار نکالنے لگا گڑے مردے
اکھاڑنے لگا اتنے میں ایک شخص بول اٹھے کہ ابھی بہت گھر باقی ہیں کیا مکان کا
قبالہ لکھوائے گا۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے اٹھنا شروع کیا جو زیادہ سرور میں تھے
آگے ان کا حال کچھ نہ پوچھئے اٹھے اور تھرتھرائے پاؤں پھسلا اور الٹا چت۔
جن میں کچھ بھی حوصلہ رہا اپنی جیوٹ سے دس پانچ قدم ہلوریں کھاتے بڑھے کہ
ٹانگیں لڑکھڑائیں بے ہوا کنکوے کی طرح جھپا کے مونڈھے کے بل آ رہے حضرت!!
ادھر تو یہ غول جاتا تھا اور ادھر سے بھی لوگوں کی آمد تھی۔ بیچ رستہ ہی میں مڈبھیڑ
ہو گئی اس وقت کا تماشا قابل دید کے تھا ؎

پکھالیں مشکیں چھینٹیں رنگ کی بڑی بوچھار　　ہر ایک سمت تھی پچکاریوں کی مارا مار
اچھل رہی تھی عبیر و گلال کی مٹھی　　کسی کا بھر گیا جامہ کسی کی پگڑی بھری

عجیب ہڑبونگ مچ گیا کسی کے منہ پر توے کی سیاہی اور تیل ملا گیا کسی کی
ریش مبارک پر کیچڑ کا خضاب کیا گیا کہیں گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کی نوبت پہنچی
رنگ کی وجہ سے وہ پھسلن ہو گئی تھی کہ معاذ اللہ قدم بڑھایا اور ارے کر کے دھڑام
سے پیٹھ کے بل گر پڑے۔
اب ذرا دیہات کا روزنامچہ ملاحظہ کیجئے۔ جس کو دیکھئے خوش خوش پھر رہا ہے
عورتیں بندی ٹکلی سے سج کر سرخ اوڑھنی اوڑھے اور چلبلی پھڑکاتی ادھر ادھر کام کاج

کر رہی ہیں مٹکی سر پر رکھے مٹکتی جا رہی ہیں تھوڑے عرصہ تک لوٹوں لٹیوں میں رنگ اچھلا کہاروں اور دھوبیوں نے ، رک پر ناچنا شروع کیا جھانجھ بجنے لگی اور راگ راگنی کے دڑبے کھول دیئے گئے شہروں اور قصبوں میں طرح طرح کے سوانگ بنائے گئے ایک طرف گورو چیلے کا سوانگ نکلا دوسری طرف بھرتری کا دونوں میں بحث چھڑی اس نے اس کا کھپڑ پھوڑ ڈالا ۔ اس نے اس کا کھیل بھڑ بھنڈ کر دیا لاگیں شروع ہوئیں سیفیں نکالی گئیں جلتی ہوئی لوہے کی زنجیریں ہاتھوں سے سونتی گئیں پھر ڈنڈوں پر لونڈوں کے ناچنے کا لگا لگا چوبولے پڑھے گئے ہا ہا ہو ہو کا شور و غل ہوا شرفا میں بھی ہولی ہوئی کپڑوں پر افشاں بھی چھڑکی گئی آپس میں ذرا نوک جھوک ہوئی ادھر ادھر کی بولیاں ٹھولیاں سننے میں آئیں یار آشنا دوگال ہنس لئے کسی نے ایک آدھ فرمائشی قہقہہ لگایا ۔ کسی نے دل لگی دل لگی میں ضلع جگت پر رکھ لیا اگر کوئی سخہ آیا جھپ سے آڑے ہاتھوں لے ڈالا ۔

خیر اس جیص بیص میں شام ہو گئی سب نے کپڑے وپڑے بدلے کمرے کی چاندنی تبدیل کی گئی جھاڑ فانوس کنول مردنگیاں لیمپ فتیل سوز روشن کئے گئے جلسہ رقص و سرور شروع ہوا ۔

آدھی رات کو جلسہ برخاست ہوا سب گھوڑے بیچ کر سو گئے صبح ہوتے ہوتے نہ وہ تماشے تھے نہ رنگ چاروں طرف خاک اڑ رہی تھی ۔
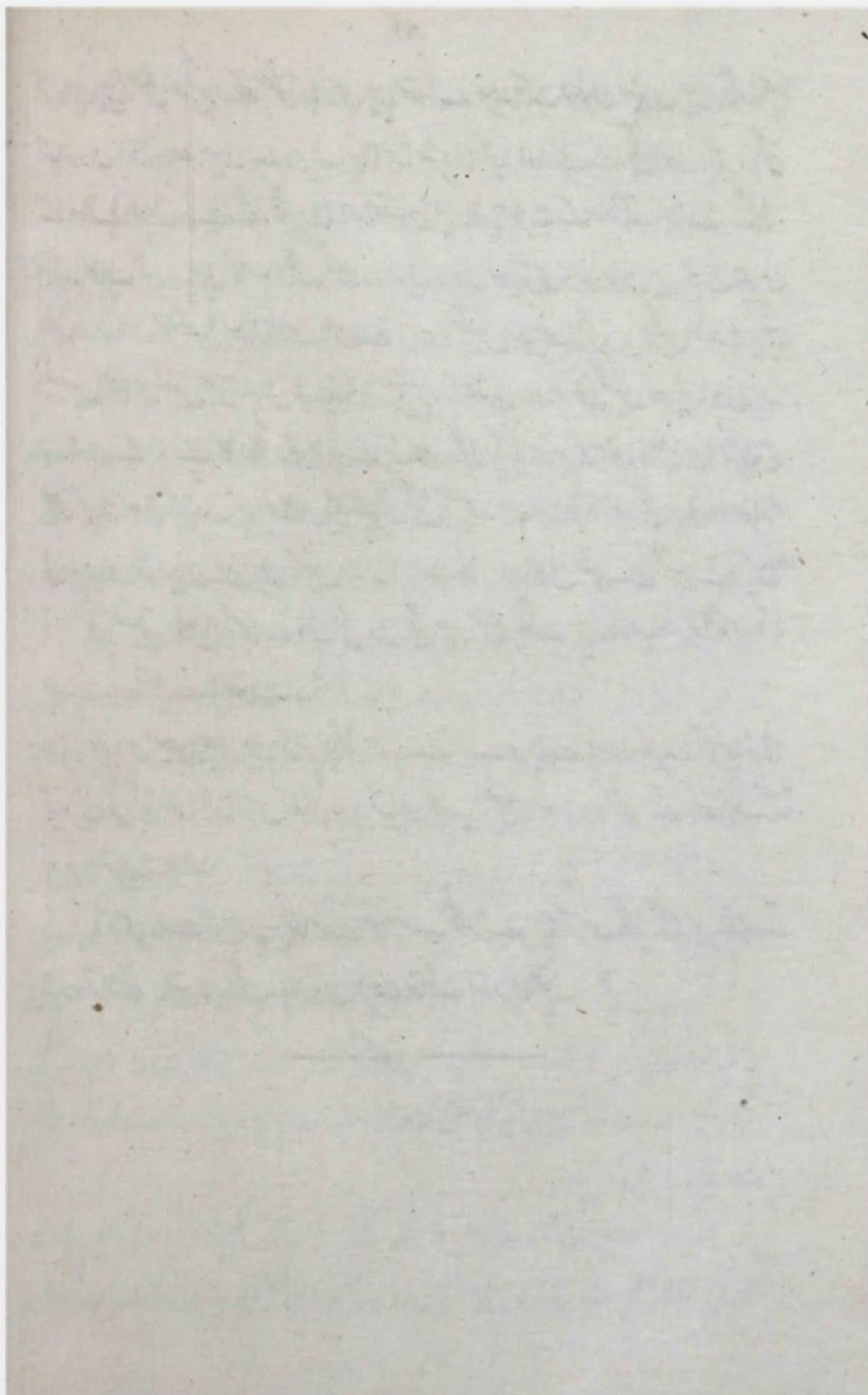
عبدالحلیم شرر

اردو زبان میں تاریخی ناول لکھے مختلف ادبی رسالے
جاری کئے شاعرانہ نثر لکھنے میں مشاق تھے اچھے مضمون نگار
صحافی اور ادیب تھے اردو زباں پر پوری مہارت حاصل تھی
الفاظ کے ذریعہ نقاشی اور مصوری کرتے ہیں فطرت کے مناظر
بیان کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے انداز بیان دلچسپ ہوتا ہی
ان کے مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوتے تھے ذیل کا مضمون
" دیہات کی زندگی " فطری مناظر اور ہمارے دیہات کی معاشرت کا
آئینہ دار ہے۔ سبک اور نرم الفاظ کا انتخاب بھی قابل توجہ ہے۔

دیہات کی زندگی

اے شہر کے عالیشان محلوں میں رہنے والو! تمھیں نہیں معلوم کہ دیہات میں رہنے والے دنیا کا کیا لطف اٹھاتے ہیں تم ایک منزل عشرت میں ہو عالم کی نیرنگیاں تمھاری نظر سے بہت کم گزرتی ہیں جس مقام پر تم ہو وہاں سحر و شام کی مختلف کیفیتیں بھی اپنا پورا اثر نہیں دکھا سکتیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ ہوا کس طرف کی چلی اور کیا بہار دکھا گئی لیکن غریب دیہات والے جنھیں تم اکثر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو وہ ان امور کا ہر وقت اندازہ کرتے رہتے ہیں ہر صبح انھیں ایک نیا لطف دیتی ہے اور ہر شام سے انھیں ایک نئی راحت نصیب ہوتی ہے۔

گاؤں کے جفاکش رہنے والے صبح ہونے سے پہلے نیند کا پورا مزہ اٹھا چکتے ہیں صبح کے تارے ہنوز جھلملانے بھی نہیں پاتے کہ وہ اپنی رات کی ضروری راحت سے اکتا چکتے ہیں ایسے وقت میں نسیم کے خوشگوار اور نازک جھونکے آتے ہیں اور بڑے ادب سے انھیں جگانے لگتے ہیں اس وقت ان کے ناز اور باد سحر کے نیاز دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں صبح کی ہوا نہایت شگفتگی کے ساتھ جگاتی ہے اور وہ نہیں جاگتے صرف کروٹیں بدل بدل کر رہ جاتے ہیں باد سحر یونہی اصرار کرتی ہوتی ہے کہ صبح کے نقیب مرغان سحر اٹھتے ہیں اور انھیں اٹھاتے ہیں۔ غریب محنت پسند لوگ تازہ دم اٹھ بیٹھتے ہیں وقت کی کیفیتوں کو نہایت غور سے اور بڑے لطف کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ جھونپڑیوں سے باہر نکل کے آسمان کو دیکھا جس میں تارے جھلملا رہے تھے افق مشرق کی روشنی پر نظر ڈالی جو رات بھر کے چمکے ہوئے

تاروں پر غالب آتی جاتی تھی کچھ کچھ نمودار ہونے والے درختوں کو دیکھا جن پر چڑیاں
چہچہا رہی تھیں۔ یہ سماں اپنی خوبیاں دکھا کر انھیں بے خود کرنے کو تھا کہ انھوں نے
اپنے دن کے کام کو یاد کیا آگے بڑھے اور رات کی دبی ہوئی آگ پر گری ہوئی پتیاں
جمع کر کے آگ جلائی تاپ تاپ کے افسردہ ہاتھ پاؤں کو گرمایا اس کے بعد پاس
کے شکستہ جھونپڑے میں جا کر بیل کھولے اور عین اس وقت جب کہ آفتاب کی کھڑی
کھڑی کرنیں مشرقی کنارہ آسمان سے اوپر کو چڑھتی نظر آتی تھیں یہ لوگ لمبے لمبے
ہلوں کو اپنے کاندھے پر رکھ کر کھیت کی طرف روانہ ہوئے کھیتوں کی مینڈھوں پر
جا رہے ہیں اور زمین کی فیاضیوں کو کس حسرت اور خوشی کی نظر سے دیکھتے جاتے
ہیں ہرے ہرے کھیت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے لہرا رہے ہیں نظر اس خوشگوار
سبزی پر لطف کے ساتھ کھیلتی ہوئی دور تک چلی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودے
جو خدا کے پاس سے دنیا والوں کی روزی کے لئے آئے ہیں کس قدر شگفتہ اور بشاش
نظر آتے ہیں رات کا برقع اڑھا کر آسمان نے انھیں اور خوبصورت بنا دیا ہے کیونکہ
تاروں کی چھاؤں میں اس وقت ان کی نازک اور چھوٹی پتیوں پر شبنم کے موتی جھلک
رہے ہیں۔ ایک عالم جواہر ہے جس پر جھلملاتے ہوئے تاروں کی شعاعیں خدا جانے
کیا کیفیتیں دکھا رہی ہیں ان جفاکیشوں نے اس وسیع میدان کو نہایت شوق سے دیکھا
وہ اس وقت تو صرف ان کی نظر کو خوش کرتا ہے مگر اصل میں قدرت کے ہدیے اور
نیچر کے تحفے ہر جاندار کو اس کی فیاضیوں سے ملتے ہیں یہ لوگ کھیتوں میں پہنچ کر اپنی
غفلت پر نادم ہو گئے کیونکہ اور لوگ ان سے پیشتر پہنچ گئے تھے۔

یہ سب لوگ تر و تازہ کھیتوں میں منتشر ہو گئے آفتاب کی کرنوں نے جو امیر و غریب
سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں کھیتوں کی مینڈھوں پر اور کنوؤں کے کناروں پر انکا
خیر مقدم ادا کیا اب یہ لوگ اپنے کام میں ایسے مصروف ہیں کہ نیچر کے جذبات بھی

ان پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے اور قدرت کی بہار بھی ان کی دلفریبی کرنے سے عاجز ہے وہ ہرا ہرا سبزہ زار وہ سہانا سماں وہ صبح کی بہار وہ تر و تازہ ہوا وہ اجلی کرنیں ایسی چیزیں ہیں جن کا شوق اکثر بے چین طبیعت والوں کو شہروں سے باہر کھینچ لے جایا کرتا ہے بارہا ہم پر ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ گھر سے دو دو تین کوس تک نکل گئے ہیں مگر یہ لوگ اپنے روزانہ کاموں میں ایسے مصروف ہیں کہ ان کیفیتوں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ زمین کی استعداد کے بڑھانے میں دل و جان سے ساعی ہیں جو صرف ان کے لئے نہیں تمام دنیا کے لئے مفید ہے جان توڑ کر محنت کر رہے ہیں غریب کم قوت بیل جو شاید رزق رسانی عالم کی فکر میں دبلے ہو گئے ہیں ان کے ہاتھوں کی مار کھاتے ہیں اور زمین کو پیداوار کے قابل بناتے چلے جاتے ہیں اپنی محنت آسان کرنے کے لئے یہ لوگ نہایت دردناک آواز میں کچھ گاتے جاتے ہیں اور انکی آواز کھلے میدان میں گونج گونج کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتی جاتی ہے۔ کنوؤں کے کنارے پانی نکال کر زمین کو سیراب اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو زندہ کر رہے ہیں دیکھو وہ کس شوق سے اس بات کے منتظر ہیں کہ ڈول اوپر آئے اور انڈیلیں اور جسوقت ڈول ان کے ہاتھ آجاتا ہے کس جوش کے عالم میں چلا اٹھتے ہیں۔ پانی ان کی بڑی دولت ہے جس کی امید میں وہ آرزومند ہو کر کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں اور کبھی کنوؤں کی طرف رخ کرتے ہیں۔

آفتاب پوری بلندی پر پہنچ کر نیچے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جھکتے جھکتے افق مغرب کے قریب پہنچتے وقت باغ عالم کی دلچسپیوں سے رخصت ہونے کے خیال سے زرد پڑ جاتا ہے خلاصہ یہ کہ آفتاب کی وضع اور حالت میں اختلاف ہو جاتا ہے مگر یہ نہ تھکنے والے اور دھن کے پکے دہقان ایک ہی وضع اور ایک ہی صورت سے اپنا کام کئے جاتے ہیں نہ محنت انھیں تھکاتی ہے نہ مشقت انھیں ماندہ کرتی ہے

نہ دھوپ سے پریشان ہوتے ہیں نہ کام کرنے سے اکتاتے ہیں۔ الغرض آفتاب غروب ہوتا ہے دن ان سے رخصت ہوتا ہے اور یہ شام کی دلفریب کیفیتوں کا لطف بخوبی دیکھ کر یہ امید لگا کے کہ کل کھیتوں کو آج سے زیادہ تر و تازہ پائیں گے اپنے کھیتوں سے رخصت ہوتے ہیں خوش خوش اس کچے اور کم حیثیت گھر میں آتے ہیں جسے ہم نہایت ذلت سے دیکھا کرتے ہیں۔ بی بی غریبی کا کھانا اور فصل کی مناسب غذا ان کے سامنے لا کر رکھ دیتی ہے اور یہ تہ دل سے خدا کا شکریہ ادا کر کے کھاتے ہیں اور دوسرے دن کی محنت کا خیال کر کے اپنے تئیں سویرے ہی سلا دیتے ہیں زاہد نماز عشا پڑھ کے سو چکا ہے بے فکرے گپیں اڑا رہے ہیں۔ شعرا مضمون آفرینی کی فکر میں ہیں امرا کے محلوں میں کھانے کا اہتمام ہوتا ہے بچے کہانیاں سن رہے ہیں طلبا کتاب پر جھکے ہوئے ہیں سیکش وہ پیاس بجھا رہے ہیں جو کمبخت نہیں بجھتی اور یہ جفاکش عجب میٹھی نیند میں غافل ہو گئے ہیں تاکہ تڑکے آنکھ کھلے یہ سچا اطمینان اور یہ سچی آسائش بیشک حسد کے قابل ہے۔

گاؤں عموماً قدرت کا سچا جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ وہاں کے سین اپنی سادگی اور دلفریب کیفیتوں کے ساتھ انتہا سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اے شہر کے نازک خیال اور چابک دست کاریگرو! وہاں تمھاری صناعیوں کی بالکل قدر نہیں وہاں صرف قدرت کی کاریگری عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور خدا کی فیاضیاں بڑی کامیابی کے ساتھ پسند کی جاتی ہیں اور نہایت شوق سے لی جاتی ہیں ان کی خوشی کا پیمانہ نہایت چھوٹا اور تنگ ہے وہ بہت تھوڑے عرصہ میں خوش ہو جاتے ہیں اور ادنی مسرت ان کی دلفریبی کے لئے کافی ہوتی ہے وہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار جن کو روز صبح و شام کو آتے جاتے وقت دیکھا کرتے ہیں ان کے مسرور کر دینے کے لئے کافی ہیں وہ تر و تازہ کھیت جن سے زیادہ پیداوار کی امید ہے ان کی خوشی کو

اعتدال سے زیادہ بڑھا دیا کرتے ہیں دیہات کا چودھری اگرچہ اس کی حکومت کچے
اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں اور ایک وسیع میدان پر محدود ہے مگر اپنے حلقہ کا پورا بادشاہ
ہے اسکے آگے وہاں کی مختصر آبادی میں ہر ایک کا سر جھک جاتا ہے اس کے راج کو
ہر شخص بلا عذر کے تسلیم کر لیتا ہے اس کے فیصلوں کا کہیں اپیل نہیں ہوتا مگر باوجود اس
حکومت کے دیکھو وہ کس بے تکلفی سے اپنے مکان کے دروازہ پر بیٹھا ہے دنیا دی
پر تکلف فرش کی ضرورت نہیں میز کرسی کو وہ ناپسند کرتا ہے قدرت کے سادے
فرش اور خدا کی زمیں پر اس کا دربار لگا ہوا ہے وہ اپنے ماتحتوں کو اپنے رتبہ کے
قریب ہی سمجھتا ہے اس لئے نہ وہ کسی ممتاز مقام پر بیٹھتا ہے اور نہ اور گاؤں والے
کسی ذلت کی جگہ پر بیٹھے ہیں۔ بس یہ حالت ہے کہ عزت ہے تو سب کی اور اگر
ذلت ہے تو سب کی۔ اس کے گھر میں وہی سامان اور وہی فرنیچر ہے جو اس کے
ماتحتوں کے گھر میں ہے۔ پیال اس کا نرم اور آرام دہ بچھونا ہے کچی مگر صاف اور
لپی ہوئی کوٹھریاں اس کی خوابگاہ ہیں جفاکش اور گھرگرست بہو بیٹیوں کے ہاتھ
پاؤں اس کے خادم ہیں کوٹھیوں میں بھرا ہوا غلہ اس کی دولت ہے چند دبلے اور
لاغر مویشی اس کا قیمتی سرمایہ ہیں ایک کم حیثیت مکان اس کی کوٹھی ہے۔ اردگرد کے
کھیت اور آس پاس کا سبزہ زار اس کا جاں فزا باغ ہے۔

گاؤں والوں کی یہ بات کس قدر قابل ذکر ہے کہ وہ ایک سادگی اور بے فکری
کی حالت میں ہیں ان کی کفایت شعاری کی زندگی کس صفائی اور اطمینان سے
گذرتی ہے ان کی فکریں ہمارے مقابل میں بہت کم ہیں اور وہ ہمارے روپیہ پیسہ کے
بھی محتاج نہیں ہیں۔ ہمارا سکہ بھی ان میں بہت کم مروج ہے چونکہ ان کی نظر ہر وقت
رزاق مطلق پر لگی رہتی ہے اس لئے وہ خدا کی بے واسطہ ضیافتوں ہی سے سکے کا
کام بھی نکال لیتے ہیں غلہ اور اناج ان کا سکہ ہے دنیا کی ہر چیز جو ان کی ضرورتیں

رفع کر سکتی ہو غلہ کے عوض میں ان کو بہ آسانی اور بہ کفایت مل سکتی ہے۔

غریب دیہاتیوں کی یہ بات اس قابل ہے کہ ہم ان سے ایک بہ کارآمد سبق لیں وہ یہ کہ ان میں پورا اتفاق ہے وہ ایک ایسے کونہ میں پڑے ہیں کہ گورنمنٹ بھی ان کی زیادہ ضمانت نہیں کر سکتی اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کو قوی نہیں بنا سکتی مگر اتفاق اُن کی قوت ہے اور باہمی ہمدردی ان کا ہتھیار رہے افلاس اور آفات سماوی بھی کبھی ان کی دشمن ہو جاتی ہیں مگر وہ اسی ہتھیار کو لے کر اٹھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں کھیتوں میں پانی پہنچاتے وقت وہ باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں اور کھیتوں میں بیج ڈالتے وقت وہ ایک دوسرے کو غلہ قرض دیتے رہتے ہیں اور سب سے بڑی یہ بات ہے کہ ایک عالم کی فکر اپنے سر لیتے ہیں اور دنیا بھر کے لئے خود مصیبت میں پھنستے ہیں۔ ہم بے فکر ہیں اور اپنی اغراض اور بقائے زندگی کے اسباب کو بھولے ہوئے ہیں وہ ہماری طرف سے اس کام کو پورا کرتے ہیں اس جفاکشی کے انعام میں خدا کی طرف سے انھیں جو کچھ ملتا ہے اس میں سے خود بہت کم لیتے ہیں اور سب ہمارے حوالہ کر دیتے ہیں ایک کسان کی زندگی پر غور کرو اور اس کی سالانہ محنت اور مشقت کا اندازہ کرو کہ کس طرح جان توڑ توڑ کر اور اپنے تئیں مٹا مٹا کر جفاکشی پر تلا رہتا ہے اور اس کے بعد یہ غور کرو کہ وہ کس لئے اس مصیبت میں پڑتا ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ دنیا کا کتنا بڑا ہمدرد ہے اور حب ملک کس قدر اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے بیشک وہ ساری دنیا کے لئے محنت کرتا ہے اور اس سے زیادہ نوع انسان کا دوست دنیا بھر میں نہ ملے گا۔

اے ہمدردی قوم کا لفظ بار بار زبان پر لانے والو! اگر اپنی کوششوں کا کچھ نتیجہ دیکھنا چاہتے ہو تو ان غریب جفاکش دہقانوں کی پیروی کرو۔ قوم کی کھیتی روز بروز

کھلائی جاتی ہے اور چند روز میں بالکل سوکھ جائے گی تمہارا فرض ہے کہ جلدی اٹھو اور جس طرح ہو سکے اپنی راحت بیچ کر ان کھیتوں میں پانی پہنچاؤ۔ قومی کھیت کے پودے یعنی موجودہ نسل بھی نہ سنبھلی تو کہیں کے نہ رہو گے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

دلی کے رہنے والے اور دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے والے، لطیف ظرافت کی نگارش میں ان کا قلم چابک دست ہے تبسم کی موج نرم خیز کے پیدا کرنے میں ان کے الفاظ زعفران زار ہیں مضامین فرحت کے نام سے ان کے مضامیں شائع ہو چکے ہیں معمولی موضوعوں میں ان کی تحریر زندگی پیدا کر دیتی ہے جس میں اخلاقی اور اصلاحی نکتے چھپے ہوئے ہوتے ہیں ایک لفظ "اونہہ" پر ان کے قلم کا زور دیکھئے۔

اونھ

خدا اس اونھ سے بچائے جس کی زبان پر آیا اس کو تباہ کیا جس گھر میں گھسا اس کو ستیاناس کیا اور جس ملک میں پھیلا اس میں گدھے کے ہل چلوادئے ثبوت درکار ہو تو دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہ اس اونھ نے زمانہ کے کیا کیا رنگ بدلے ہیں جرنیل گروش کو نپولین حکم دیتا ہے کہ انگریزوں کی فوج کے پیچھے ابھی پہنچ جاؤ اور پو پھٹنے سے پہلے پشت پر دباؤ ڈالو۔ میں سامنے سے حملہ کرتا ہوں۔ بلوشر کے آنے سے پہلے اس فوج کو رگڑ ڈالیں گے جرنیل گروش اونھ کر دیتا ہے صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر روانہ ہوتا ہے واٹرلو کی لڑائی نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کا نقشہ بدل دیتی ہے۔

ہندوستان میں بھی اس اونھ کا کچھ کم زور نہیں رہا ہے نادر شاہ چڑھا چلا آرہا ہے محمد شاہ بادشاہ رنگ رلیاں منا رہے ہیں پرچہ لگتا ہے کہ نادر لاہور تک آگیا بادشاہ سلامت اونھ کر دیتے ہیں جس کا فارسی ترجمہ تاریخوں میں "ع این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ" کیا گیا ہے۔ لیجئے ان کی ایک اونھ سے دلی لٹ جاتی ہے خزانہ خالی ہو جاتا ہے تخت طاؤس اڑ جاتا ہے۔ مرہٹے بڑھے آرہے ہیں دہلی پر قبضہ کر کے گنج پورہ لوٹ لیتے ہیں احمد شاہ ابدالی کو خبر ہوتی ہے وہ بدلہ لینے چلتا ہے ہلکر اور سیندھیا دونوں مل کر بھاؤ کو سمجھاتے ہیں کہ توپ خانہ ہیں چھوڑ دو ہلکے پھلکے ہو کر مقابلہ کرو آمنے سامنے سے لڑائی ابدال سے مشکل ہے بھاؤ اونھ کر دیتا ہے اس اونھ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سلطنت ہند کا جو خیال مرہٹوں کو تھا وہ پانی پت کی لڑائی سے خواب ہو جاتا ہے۔

پہلے تو جو کچھ تھا وہ تھا آج کل اس ادھنے کا ہندوستان بھر میں بڑا دور دورہ ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کے انتظام کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھتا ادھر رعایا کے مطالبات پر گورنمنٹ نے ادھنے کی اور ادھر اس ادھنے کا جواب بم سے ملا۔ ذرا گورنمنٹ کے انتظام پر رعایا نے ادھنے کی اور اس ادھنے پر مشین گن کی گولیاں برس گئیں رعایا کی حالت دیکھو تو یہاں بھی اس ادھنے کے نتیجے موجود ہیں۔ مسلمان مسلمان میں جھگڑا ہندو ہندو میں جھگڑا ہندو مسلمان میں جھگڑا شمال جنوب میں جھگڑا شرق مغرب میں جھگڑا یہاں تک کہ زمین آسمان میں جھگڑا۔ اگر یہاں ادھنے کا کچھ عرصہ یونہی زور رہا تو سوراج ملنا کیا غلامی بھی نصیب ہونی مشکل ہے۔

ملک کے بعد اب جلسوں کی کیفیت دیکھو تو وہاں بھی یہی رنگ نظر آئے گا ممبر ہیں کہ بنے ٹھنے گدے دار کرسیوں پر رونق افروز ہیں اسپیکر جوش میں بہہ کر کہیں سے کہیں نکلے جا رہے ہیں ممبروں نے تھوڑی دیر یہ بے سلسلہ گفتگو سنی اور ادھنے کہہ کے آنکھیں بند کر لیں لیجئے ان کے لئے تو جلسہ کی کارروائی ختم ہوگئی۔ جو ممبر ذرا آنکھیں کھولے بیٹھے ہیں وہ بلاٹنگ پر پھول پتے یا گدھے اور آدمیوں کی تصویریں بنا رہے ہیں کوئی ان بھلے آدمیوں سے پوچھے کہ حضرت یہاں آپ سونے اور تصویریں بنانے آئے ہیں یا ملک کے لئے کچھ کام کرنے۔ ووٹ لینے کا وقت آیا انھوں نے بے سوچے سمجھے مخالفت یا موافقت میں ہاتھ اٹھا دئے ان کو نہ یہ معلوم کرنے کی ضرورت کہ اس مضمون پر کیا بحث ہوئی اور نہ یہ جاننے کی حاجت کہ حالات کے لحاظ سے تردید کرنی چاہئے یا تائید۔ یہ تو صرف ادھنے کرنے اور ہاتھ اٹھانے آئے تھے اس فرض کو پورا کر دیا اب جلسہ کرنے والے جانیں اور ان کا کام جانے۔ جلسہ ختم ہونے پر ان لوگوں سے پوچھو تو انشاءاللہ نوے فی صدی ادھنے سے جواب دیں گے جس کے یہ معنی ہوئے کہ جلسہ بیکار اسپیکر بیوقوف اور سننے والے گدھے۔

طالب علموں میں دیکھو ادھنہ کا زور سب سے زیادہ انہی میں پاؤ گے سال بھر کھیل کود میں گزار دیا۔ امتحان کا خیال آیا تو ادھنہ کر دی یعنی "کل سے پڑھیں گے۔ آخر یہ ادھنہ یہاں تک کھینچی کہ امتحان آگیا فیل ہوئے اس فیل ہونے پر بھی ادھنہ کر دی۔ یہ ادھنہ بہت ہی بامعنی ہوتی ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ باپ زندہ ہیں کھانے پینے اور اڑانے کو مفت ملتا ہے اگر وہ بھی مر گئے تو جائداد موجود ہے۔ قرضہ دینے کو ساہوکار تیار ہیں پھر پڑھ لکھ کر کیوں اپنا وقت ضائع کریں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے صرف اٹھارہ برس ہی کی تو ہے اگر مڈل کے امتحان میں دو چار بار فیل ہو چکے ہیں تو کیا ہرج ہے تیس سال کی عمر تک بھی انٹرنس پاس کر لیا تو سفارش کے بل پر کہیں نہ کہیں چپک ہی جائیں گے یا کم سے کم ولایت جانے کا قرضہ تو ضرور مل جائیگا اور ذرا کوشش کی تو بعد میں معاف ہو سکے گا۔

اس فیل ہونے پر ادھر انھوں نے ادھنہ کی ادھر ماں باپ نے ادھنہ کی اس صورت میں ابا اور اماں کی ادھنہ کا دوسرا مطلب ہے یعنی یہ کہ بچہ ابھی فیل ہوا ہے دل ٹوٹا ہوا ہے ذرا کچھ کہا تو ایسا نہ ہو کہ رو رو کر اپنی جان ہلکان کرے یا کہیں جا کر ڈوب مرے غرض اس ادھنہ نے صاحبزادہ صاحب کی تعلیم کا خاتمہ بالخیر کیا۔

گھر والی کی ادھنہ سب سے زیادہ خطرناک ادھنہ ہوتی ہے کسی ماما پر خفا ہو رہی ہیں وہ برابر جواب دے جاتی ہے یہ ادھنہ کر کے خاموش ہو جاتی ہیں نیچے نوکر شیر ہو گئے گھر کا سارا انتظام درہم برہم۔ خود ان کے اختیارات سلب۔ گھر کی حکومت ان سے چھن ماماؤں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ کوئی چیز چوری گئی بیگم صاحب نے ادھر ادھر ڈھونڈا کچھ تھوڑا بہت غل مچایا آخر ادھنہ کر کے بیٹھ گئیں۔ اب کیا ہے پٹاری میں سے کتھا چھالیا غائب۔ خرچ کی صندوقچی میں سے روپئے پیسے غائب صندوقوں میں سے کپڑے غائب غرض رفتہ رفتہ سارے گھر کا صفایا ہو گیا ماما نے

کوئی رکابی توڑ ڈالی شکایت ہوئی انھوں نے وہی اپنی اودھم کا استعمال کیا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں الماری کے پیچھے سے شیشہ اور چینی کا اتنا ٹوٹا ہوا سامان نکلا کہ خاصے کئی صندوق بھر جائیں. بچوں نے کوئلہ سے دیواروں پر لکیریں کھینچیں دروازوں پر پنسل سے کیڑے مکوڑے بنائے پہلے تو یہ تھوڑی بہت بگڑیں پھر اودھم کر کے چپ ہو گئیں اب جا کر دیکھو تو تھوڑے ہی دنوں میں تمام مکان نقش و نگار سے "غیرت دہ غارہائے اجنبہ" ہو گیا۔

اب رہے میاں تو ان کی اودھم سب سے زیادہ تیز ہے. بیوی کسی بات پر بگڑیں میاں اودھم کہہ کر باہر چلے گئے اب نہ تو میاں کی کوئی عزت نوکروں میں رہی اور نہ بیوی کی نگاہ میں۔ ماما نے پندرہ روپیہ کی لکڑیاں جلا دیں۔ میاں کو غصہ آیا اور کیوں نہ آتا۔ محنت کی کمائی اس طرح جلتی دیکھ کر کیوں نہ دل جلے کچھ بڑبڑائے بیوی کی طرف امداد کے لئے دیکھا انھوں نے اودھم کر دی ماما نے یہ رنگ دیکھ دوسرے پندرہ واڑے میں بیس روپیہ کی لکڑیاں پھونک دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میاں بیوی کی یہ اودھم بعض دفعہ وہ کام کر جاتی ہے جو بڑے بڑے افلاطون صلاح کار بھی نہیں کر سکتے. بیوی کو غصہ آیا میاں نے اودھم کر دی جلو لڑائی کا خاتمہ ہوا میاں کسی بات پر بگڑے. بیوی نے اودھم کر دی میاں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اگر اودھم کی بجائے جواب دیا جاتا تو میاں کو گھر چھوڑنا اور بیوی کو اپنے میکے جانا پڑتا ہے یہ کہ ہندوستان کے بہت سے گھر اس اودھم ہی نے بچا رکھے ہیں۔

ہر معاملہ کی دو ہی صورتیں ہیں فتح یا شکست اور دونوں صورتوں میں اودھم نقصان دہ ثابت ہوتی ہے شکست پر جس نے اودھم کی اس نے گویا شکست کو شکست نہ سمجھا ایسی شکل میں وہ تلافی کی کیا خاک کوشش کرے گا۔ جس نے فتح پر اودھم کی اس نے گویا اپنی ہمت کی قدر نہیں کی

وہ آج نہیں ڈوبا تو کل ڈوبے گا دنیا میں وہی لوگ کچھ کر سکتے ہیں جو فتح کو فتح اور شکست کو شکست سمجھیں اب رہے ادھ والے جو لاپرواہی سے شکست اور فتح کو برابر سمجھتے ہیں ان کا بس خدا ہی مالک ہے دنیا سے اگر مٹ نہ جائیں گے تو کم سے کم جوتیاں ہمیشہ ضرور کھائیں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس ادھ کے مسئلہ ارتقا سے کچھ بحث بھی کر دی جائے اور یہ بتایا جائے کہ یہ پہلے کیا تھی اور کیا سے کیا ہو گئی ہم لوگ تقدیر بلا تعلق تدبیر کے قائل ہو گئے ہیں اور اس یقین سے ہم کو یہ فائدہ پہنچا ہے کہ کوئی ذمہ داری ہم پر باقی نہیں رہی ہے اس لئے ہماری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس خالص تقدیر کے مدارج جتنے بڑھائے جا سکتے ہیں اتنے بڑھا دیں یہ خوب جانتے ہیں کہ صفت کے تین درجے ہوتے ہیں اس لئے پہلے تو ہم نے اس تقدیر کو ان تین درجوں پرے جا کر صبر و رضا اور تسلیم تک پہنچایا لیکن اس سے بھی جب ہماری سیری نہیں ہوئی تو چوتھا درجہ ادھ کا نکالا تقدیر خالص کا یہ وہ آخری زینہ ہے جہاں اتنا بھی خیال آنا کہ ہم نے اس معاملہ میں تسلیم سے کام کیا ہے گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے ہماری ہمتوں کی تعریف کرنی چاہیئے کہ ہم اس آخری زینہ کو بھی طے کر چکے ہیں اور اگر زمانہ کی یہی حالت رہی تو تھوڑے ہی دنوں میں اس ادھ سے بھی کچھ اونچا مقام نکال کر وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے اور انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

سر شیخ عبدالقادر

اردو کے محسنوں میں سے تھے ۱۹۰۱ء میں لاہور سے اُردو کا
مشہور ادبی رسالہ مخزن جاری ہوا آپ اس کے ایڈیٹر تھے
جس میں آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے جو مشہور و مقبول ہوئے
اردو ادب کی ترقی ہمیشہ آپ کے پیشِ نظر رہی ہے۔ یورپ اور
دیگر ممالک اسلامیہ کا سفر کیا تھا اس لئے سفر کے فوائد اور لذات
سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اس لئے ان کے قلم سے "گھر سے
نکل کے دیکھو" کے عنوان پر مضمون نہ صرف نظریاتی اور تخئیلی
ہو سکتا ہے بلکہ ان کا تجربۂ زندگی بھی ہے زبان صاف ستھری ہے
خیالات میں الجھاؤ نہیں۔

گھر سے نکل کے دیکھو

سفر وسیلہ ظفر ہے۔ یہ اگلے زمانہ میں بھی سچ تھا اور آج بھی سچ ہے بلکہ پہلے
کم تھا اب زیادہ پہلے افراد پر عائد ہوتا تھا اب اقوام پر حاوی ہے کسی ترقی
کرتی ہوئی قوم کا نام لو جو اس کے فائدہ سے بے خبر ہو۔ دنیا کی موجودہ تجارت
کا فروغ اسی اصول پر مبنی ہے جرمنی آج کل صنعت وحرفت کی ترقی میں اول
درجہ پر شمار کیا جاتا ہے کیا اس صنعت وحرفت کا مدار محض اہل جرمنی کی قدردانی
پر ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اہل ملک بھی اپنے مال سے بڑھ کر کسی کے مال کو
نہیں سمجھتے دوسرے ملکوں کی بنی ہوئی چیزیں اگر جرمنی میں راہ پانے کی کوشش
کریں تو وہاں کی حکومت ان اشیا پر بھاری محصول لگاتی ہے تاکہ ملکی اشیا کا مقابلہ
نہ کر سکیں مگر یہ وہاں کی صنعتی ترقی کا ایک جزو ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جزو اعظم
بیرونی تجارت پر منحصر ہے دنیا کا کون سا گوشہ ہے جہاں جرمنی ساخت کا مال نہیں
پہنچتا چین میں اس کی کھپت ہے روم میں اس کی قدر ہے افریقہ کی منڈیاں وہ
گھیرے ہوئے ہے اور ہندوستان کے بازاروں میں وہ انگریزی ساخت کی
چیزوں سے بڑھ کر بکتا ہے یہاں تک کہ خود انگلستان باوصف تجارتی ملک ہونے
کے جرمنی ساخت کی اشیا کے دست برد سے نہیں بچ سکتا اور لندن کے بازاروں
میں لاکھوں کا مال جرمن سے آیا ہوا بکتا ہے امریکہ بھی اس ترقی میں کسی سے کم نہیں
اور انگلستان بھی اول درجہ کے تجارتی ممالک میں ہے اس کے سوا یورپ کے قریب
قریب سب ملک اس تجارتی لوٹ میں جو دنیا میں مچ رہی ہے کم وبیش حصہ دار ہیں
مشرقی اقوام میں سے جاپان نے حال ہی میں اس گر کو سیکھا ہے اور جاپانی چیزیں بھی

جابجا پھیلتی جاتی ہیں اب ہندوستان کی باری ہے ہاتھ کے کام میں اب بھی ہمارا وطن
کسی سے کم نہیں اور ابھی کل کی بات ہے کہ یورپ کی دکانوں میں ہندوستان کی دستکاری
مہنگے داموں بکتی تھی اب مشین کا زمانہ آگیا ہے اور صنعتی اور تجارتی لڑائی میں اس قوم کا
جو کل کا مقابلہ ہاتھ سے کرنا چاہے وہی حال ہوگا جو میدان جنگ میں توپ کا مقابلہ تیر و
تفنگ اور بندوق کا سامنا تیغ و سناں کے ساتھ کرنے سے ہوتا ہے وقت آپہنچا ہے
کہ ہند جاگے اور اس کے ساتھ اہل ہند کی قسمت۔ اور ہندوستان والے دنیا کی معزز اور
صنعتی و تجارتی اقوام کی مجلس میں برابر کی کرسی لیں اس کا آغاز تو پہلے گھر کی خبر لینے سے
ہی ہوگا کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے کارخانوں سے خریدیں مگر اس کی معراج یہ ہے
کہ ہندوستان کا مال زمانۂ سابق کی طرح اطراف دنیا میں پھیلنے لگے بیشک یہ منزل دور
ہے اور دشواریاں بھی رکھتی ہے لیکن اس کا پیش نظر رہنا بہرحال ضرور ہے۔ مسافر کی
رفتار پر اس علم کا اثر ہوتا ہے اور کوشش کا معیار جتنا بلند رہے مفید ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی کی تدبیریں کیا ہیں۔ تدبیریں تو مختلف ہیں اور سب
اپنی اپنی جگہ ضروری مگر ہندیوں کا بہ کثرت دنیا کے دوسرے ملکوں میں پھیل جانا انہیں
سے ایک تدبیر ہے جس کی اہمیت میرے دل پر روز بروز نقش ہوتی جاتی ہے۔ صنعتی
تعلیم کے لئے سفر درکار ہے۔ تجارتی تعلقات بڑھانے کے لئے سفر درکار ہے محنت
مزدوری کے ڈھونڈنے کے لئے سفر درکار ہے مگر ان کے علاوہ بعض فوائد دوسرے
ممالک میں چندے قیام پذیر رہنے سے وابستہ ہیں جن کا احساس وطن میں کم ہوتا ہے
اور زیادہ تر وطن کے باہر ہی ہو سکتا ہے دوسری قوموں کے اوضاع و اطوار دیکھنے
سے خیالات میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے جو نہایت قابل قدر ہے اور جب کسی
ملک میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو جو عرصہ تک باہر رہے ہوں اور جنھوں نے
اپنے یہاں کی ہوا کے سوا اور مقامات کی بھی ہوا کھائی ہے تو نا معلوم طور پر ایک قسم کا

تغیر ملک کے حالات اور خیالات میں پیدا ہونے لگتا ہے جیسے میدہ پر خمیر کا اثر ہوتا
ہے اور بہت سی ترقیاں اور بہت سی اصلاحیں ہیں جو پہلے ناممکن نظر آتی تھیں وہ
ممکن معلوم ہونے لگتی ہیں اور کئی تعصبات جو پہلے سدراہ ہوتے تھے راستہ سے ہٹ جاتے
ہیں ہاں اس نیتجہ کے مترتب ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ جو لوگ سفر سے مستفید ہوں
وہ اس کے فوائد اخذ کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں اور ان میں بیشتر ایسا سفر کریں
جس کے اخراجات وہ سفر ہی سے نکال لیں نہ یہ کہ سب ملک کا روپیہ باہر صرف کرآئیں
اب تک جو لوگ سفر یورپ کو نکلے ہیں وہ عموماً یا تو طالب علمی کے لئے نکلے ہیں یا
محض سیاحت کے لئے اور ان لوگوں کی تعداد جو تجارت کی غرض سے یورپ آئے
ہیں ابھی بہت کم ہے تاہم اس سلسلہ کا آغاز ہی دل خوش کن ہے اور ایسے اصحاب
کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے لیکن میری مراد سفر سے سفر یورپ ہی نہیں ہے
بلاشبہ یورپ اس وقت رونق کا مرکز ہے اور صاحبان توفیق کے لئے اسکا دیکھنا
خالی از لطف و فائدہ نہیں مگر میرا مدعا سفر سے عام سفر ہے چین کا ہو یا جاپان کا روم کا
ہو یا ایران کا تہذیب کے دعوے دار یورپ کا ہو یا تہذیب کے شکار افریقہ کا
سب سے سبق مل سکتا ہے سب سے فائدہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ کوئی محنت اور
لیاقت کے جوہر لے کر نکلے اور ہمت کی رفاقت نہ چھوڑے کلکتہ اور بمبئی اور ہندوستان
کے بعض اور بڑے شہروں میں ایک معقول تعداد چینیوں کی ملتی ہے جو مختلف
صنعتی اور تجارتی طریقوں سے روپیہ کما رہے ہیں اور بوٹ بنانے میں خصوصیت
سے استاد ہیں کیا ان کے مقابل میں چین کے کسی مقام میں ایسی یا اس کے قریب
تعداد ہندی دستکاروں کی موجود ہے ؟ نہیں ۔ انگریز تاجروں کو لو اور ان کے کارخانوں
کو دیکھو جو روپیہ گورنمنٹ کے خزانے میں ہمارے ہاں سے جاتا ہے اس کی بابتہ
تو فریادیں ہوتی ہیں کہ ہم لوٹے جا رہے ہیں کیا یہ بھی گورنمنٹ کا قصور ہے کہ سب

بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں۔ بہت سے بڑے کارخانے قریباً سب بستیاں جو چائے
تیل قہوہ کی پیداوار کے لئے قائم ہیں انگریز تاجروں کے ہاتھ میں ہیں کیا اگر خود
اہل ملک مشترکہ سرمایہ کی بڑی بڑی کمپنیاں رکھتے ہوں اور ان کاموں میں حصہ لیں
اور انگریز تاجروں کے نفع میں خود بھی شریک ہوں تو کوئی انھیں روکتا ہے؟ چاہئے
تو یہ کہ ہر انگریز کے جواب میں جو ہندوستان میں تجارت کرکے روپیہ کماتا ہے ایک
ہندی تاجر انگلستان میں روپیہ کما رہا ہو ہر فرانسیسی تاجر کے جواب میں ہندی کوٹھی
فرانس میں ہو ایران تجارتی اقوام کے لئے زرخیز منڈی ہے جب دور دور سے
قومیں آکر وہاں سے روپیہ کما سکتی ہیں تو ہندوستان والے جو پاس رہتے ہیں کیوں
مستفید نہ ہوں خلیج فارس کے سواحل پر چند جگہ ہندوستانیوں کی دکانیں ہیں کیوں
اس سے زیادہ نہ ہوں ملک کے اندر کے شہروں میں کیوں ہندی تاجر گھس نہ جائیں
روم میں ہر قوم کے تاجر ہیں نہیں موجود تو ہندی ہی نہیں افریقہ کے بعض حصوں
میں ہندوستانی جانے لگے تھے اور کام بھی ان کا خاصا بن چلا تھا مثلاً جنوبی افریقہ
میں اور وہاں آب و ہوا بھی اچھی تھی مگر وہاں فرنگی اقوام کو ان چند آدمیوں کی
کامیابی بھی کانٹے کی طرح کھٹکی اور انھوں نے ان کے راستہ میں بے حد دقتیں ڈالدیں
اور ان کا جانا قریب قریب بند کر دیا اچھا یہ دروازہ بند ہے تو بند ہی سہی اور کئی
دروازے افریقہ میں کھلے ہیں وہاں گھس جائے اور جو دروازہ بند ہے اس کو بھی
کھٹکھٹاتے رہو کبھی تو کھلے گا ہی۔ جنوبی امریکہ کے بعض حصوں میں کچھ ہندی اچھی
حالت میں ہیں وہاں ان کے خلاف تعصب بھی کم ہے وہاں کچھ اور بھی کھپ سکتے
ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ جمیع اقوام عالم کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی ہے
جرمنی سے روس سے فرانس سے انگلستان سے لوگ وہاں جاتے ہیں اور وہیں کے
باشندے قرار پا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں اگر بہت سے ہندوستانی وہاں جا کر بسنا

چاہیں تو وہ کیا رویہ اختیار کریں لیکن تاحال ان کا سلوک ہندوستانی سیاحوں واعظوں اور طلبا سے بہت عمدہ ہے۔ آزادی کی سرزمین ہے زرخیزی میں دنیا کے کسی حصہ سے کم نہیں محنت مزدوری کے لئے اچھی ہے بشرطیکہ کوئی ہنر کسی کے پاس ہو وہاں قسمت آزمائی کرنے والے نکلنے چاہیں۔ کنیڈا تو سلطنت برطانیہ ہی کا حصہ ہے اور اس میں ہزاروں ایکٹر زمین کاشتکاری کے ہاتھ کا انتظار کر رہی ہے وہاں کی گورنمنٹ آئے دن دیگر ممالک یورپ میں ایجنٹ بھیجتی ہے کہ لوگوں کو ترغیب دے کر لاؤ کہ زمین مفت ملے گی وہ آکر قابض ہو جائیں اور آباد کریں آئے دن سینکڑوں جاتے ہیں مگر ادھر سے ہل من مزید کی آواز بھی جاری ہے کچھ ہمت ور پڑھے لکھے ہندوستانی اگر چاہیں تو عجب نہیں کہ انھیں وہی رعایات مل جائیں جو اور آباد کاروں کو مل رہی ہیں اور اگر یہ تجربہ کامیاب ثابت ہو تو پھر اور زیادہ لوگ جانے لگیں گے غرض امنگ اور جستجو شرط ہے پھر اس میں کچھ کلام نہیں پائے گدا لنگ نیست۔ ملک خدا تنگ نیست۔

اس تحریک پر اعتراض دو ہو سکتے ہیں اول تو یہ کہ ہمارا ملک خود بہت وسیع ہے اس میں بھی بہت سی زمین قابل زراعت موجود ہے پھر باہر جانا کیا معنی دوسرے یہ کہ آگے ہی ملک میں کام کرنے والے کم ہیں اگر اس طرح باہمت آدمیوں کا ایک معتدبہ حصہ ملک سے باہر چلا جائے تو ملک اور بھی غریب ہو جائے گا اعتراض دونوں بجا اور جاندار ہیں۔ جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے اندر جو ترقی ممکن ہے وہ بھی کیجئے اور ضرور کیجئے۔ لیکن اگر قوموں میں نام پیدا کرنا ہے تو دوسری قوموں سے بھی رشتہ پیدا کرنے کی بنیاد ابھی ڈال دو ہندوستان میں تمھاری سب کوششیں حدود سے گھری ہوئی ہیں باہر نکل کر جو لوگ آزادی کی آب وہوا میں زندگی بسر کریں گے اور اپنی قوموں کا دوسری قوموں سے موازنہ کریں گے انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی وجہ

نہیں ہے کہ ہندی کسی سے کم رہیں۔ ان کی حیثیت کا عکس دوسروں کی حیثیت پر پڑے گا اگر وہ باہر اپنی قابلیت کا سکہ جما دیں گے اور اپنے چلن کی خوبی کا اعتراف کرائیں گے تو ملک میں جو ان کے بھائی ہوں گے انھیں بھی اس نیک نامی کا حصہ لے گا اس نظر سے یہ تدبیر امتحان کے قابل ہے اور یہ ایثار کر گزرنے کے لائق۔ رہا دوسرا اعتراض کہ کام کے آدمیوں سے ملک کو خالی نہ کرنا چاہئے۔ اس کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص جو باہر نکلنے کا تہیہ ملک کی خاطر کرے وہ اس ارادہ کے ساتھ ہی یہ عہد کر کے جائے کہ کامیابی کے بعد وہ ممالک غیر کو وطن ہی نہ بنائے گا اور اپنی عمر کا آخری حصہ اور اپنی محنت کی کمائی ملک کی بھلائی میں صرف کریگا اور جو کسی اتفاق سے اپنے نئے وطن کا باشندہ ہو جائے وہ اپنے وطن مادری سے کبھی رشتہ نہ توڑے اور دور بیٹھ کر ہند کے لئے باعث تقویت رہے اور حتی المقدور ملک کی بہتری کے لئے کوشش کرتا رہے۔ جو کام فرزندان انگلستان دنیا کے دور دراز حصوں میں جا بسنے پر بھی انگلستان کے لئے کرتے ہیں وہی کام ہر ہندی ہندوستان کے لئے کرتا رہے اس خیال کو خیالی اور موہوم نہ سمجھنا چاہئے۔ جب قومیں بننے لگتی ہیں اور ان کے بھلے دن آتے ہیں تو ان کے عزم وارادے میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے افراد جو گھر سے ارادہ کر کے نکلتے ہیں اس سے کبھی نہیں ٹلتے پس اگر حب وطن کا ہندیوں پر یہ اثر ہو کہ وہ اپنا گھر گھنا پن چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کریں نئے مقامات میں رزق ڈھونڈنے کی مشکلات کا سامنا کرنے اور کامیاب اقدام کے ہاتھوں طرح طرح کی ذلتیں سہنے لگیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ وہ وطن سے نکل کر وطن کو یاد رکھیں اور اپنی فتح اور کامیابی کی گھڑیوں میں بھی اس کے حق سے غافل نہ ہوں۔ اگر ڈھب کے آدمی نکلنے لگیں تو تجارت زراعت صنعت اشاعت مذہب کے اسباب تحریک کے لئے موجود ہیں۔ موجودہ

حالت کے مصداق مجھے دو چار مصرعے سوجھے ہیں لکھے دیتا ہوں شاعر ہوتا تو ایسی تحریر کے بجائے ایک مختصر اور پرزور نظم لکھ دیتا جسے لوگ گاتے پھرتے اب ان مصرعوں پر اکتفا کرتا ہوں ۔ ع اگر بشاعری یک اشارت است بس

بخت آزمانے نکلو جنگل بسانے نکلو
کڑیاں اٹھانے نکلو جانیں لڑانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو
ہندوستان والو
دولت کمانے نکلو حکمت اڑانے نکلو
مذہب سکھانے نکلو ہر ہر بہانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو
ہندوستان والو

غرض نکلو تو سہی مگر ایک شرط ملحوظ رہے ۔ اس طرح گھر سے نہ نکلو کہ نہ گھر کے رہو نہ گھاٹ کے بلکہ سامان کے ساتھ جس سے اپنی عزت بڑھے اور ملک کی شان ۔ ایسا نہ ہو کہ جو بالکل بے زر ہیں وہ بغیر مآل کا سوچے وطن کو چھوڑ دیں تجارت والے سرمایہ کا بندوبست کر کے نکلیں تعلیم کے شائق پہلے گھر سے خوب پڑھ کر نکلیں زراعت کیلئے جائیں تو خود اس فن سے واقف ہوں اور واقف کار آدمیوں کو ساتھ لے جائیں صنعت والے اس قابل ہوں کہ چار باتیں کسی سے سیکھیں تو چار اس کو سکھا بھی سکیں ۔ جس ملک میں جائیں اسکی زبان پہلے حاصل کرنے کی کوشش کریں ۔ اور اس کے اوضاع واطوار سے واقفیت بہم پہنچالیں ۔ وہاں دن بسر کریں تو اس طرح کہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ابناء وطن کی عزت کا ہر وقت پاس رہے ۔ اگر بڑھیں اور ان احتیاطوں کے ساتھ بڑھیں تو کوئی دن ہیں وہ کامیابیاں جو اب اوروں کے حصہ میں ہیں ہمارے احاطہ دسترس میں

ہونگی اور یہ جو ناکامیوں کی شکایت اب ہے ان کا خاتمہ ہو جائیگا۔

لندن میں ہزارہا یہودی روس سے آتے ہیں اور چند دنوں میں کاروباری بن جاتے ہیں چند سال کے بعد انگریزوں کے سے حقوق حاصل کرتے ہیں اور ان کی اولاد ہر اعتبار سے انگریز کا حکم رکھتی ہے۔ فرانسیسی جرمنی ارمنی یونانی اطالیہ کے باشندے ہسپانیہ کے باشندے آسٹریلیا کے رہنے والے روس کے ساکن غرض ہر ملک کے قائم مقام انگلستان کے بڑے شہروں میں روزی کما رہے ہیں اور محروم ہیں توہم۔ جن کا اتنا حق انگلستان پر ہے اور جن سے انگلستان کو بے شمار نفع پہنچتا رہتا ہے۔ یہی حال سلطنت برطانیہ کے دیگر حصص اور امریکہ وغیرہ میں ہے اور جوں جوں اس کیفیت کو ہم بچشم خود دیکھتے ہیں دل کڑھتا ہے اور یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے ہم وطن بھی نکل پڑیں اور اس خوان یغما میں شریک ہوں۔
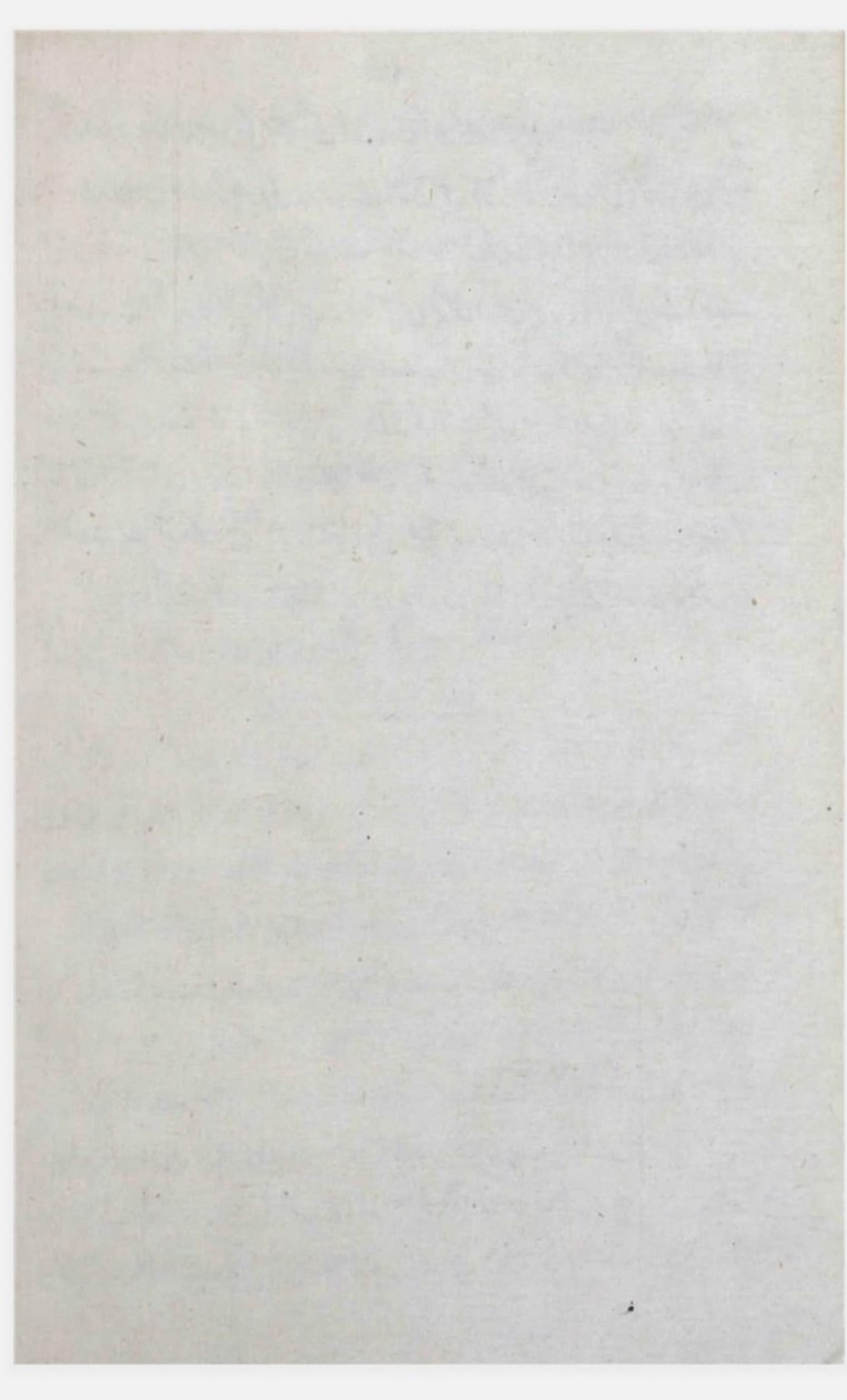
مولانا ابوالکلام آزاد

اردو زبان کے مشہور ادیب الہلال والبلاغ کے ایڈیٹر تھے سیاسی مشغولیتوں کی بنا پر ادبی صلاحیتیں مکمل طور سے ظہور پذیر نہ ہوسکیں ان کی انشا پردازی میں، ان کی شخصیت اس طرح گھلی ملی ہے جس کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ایک خاص انداز نگارش کے مالک ہیں جس میں عربیت اور فارسیت کا غلبہ ہے جدید ترکیبوں کے تراشنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ دقیق رنگین نثر کی مثال مولانا آزاد کی تحریر ہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں سیر حاصل بحث کرتے ہیں ہر موضوع میں نئے نئے گوشے پیدا کرتے ہیں حافظہ میں اشعار کا ذخیرہ محفوظ ہے نہایت برمحل اشعار لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاقی اور روحانی اقدار ہر محل پر پیش نظر رہتے ہیں" جنگ کا اثر اخلاق پر"، ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے۔

جنگ کا اثر اخلاق پر

دنیا کے گوشہ گوشہ میں قوت کا خزانہ پنہاں ہے۔ بجلی کی رو خاک کے ہر ذرے میں موجود ہے نمو کی قوت زمین کے چپہ چپہ میں مخفی ہے موجوں کا تلاطم ہر دریا کے اندر چھپا ہوتا ہے لیکن یہ قوتیں خود بخود نہیں ابھرتیں بلکہ اپنے ظہور کے لئے ایک سخت کشمکش ایک سخت مقاومت ایک سخت تصادم کی منتظر رہتی ہیں پس جب کوئی قوت ان کو ٹھوکر لگا دیتی ہے تو وہ برہم ہو کر اپنے چہرہ تابناک سے نقاب الٹ دیتی ہیں حرکت بجلی کے خزانہ میں آگ لگا دیتی ہے سیلاب کی رو زمین کی قوت نمو کو ابال دیتی ہے ہوا کے جھونکے سطح دریا پر موجوں کا جال پھیلا دیتے ہیں۔

اخلاق بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون وارواح میں چھپی ہوئی ہے لیکن اگر عطر کو شیشی میں بند رکھا جائے تو وہ مشام جان کو معطر نہیں کر سکتا۔ اس کی بوئے جان فزا بار بار کے ہلنے ہی سے پھیلتی ہے اسی طرح اگر انسان تمام دنیا سے الگ ہو کر ایک قلۂ کوہ پر عزلت گزینی اختیار کرے تو اس کا اخلاقی جوہر ہمیشہ کیلئے پہاڑ کے تاریک غاروں میں چھپ جائے گا لیکن خدا نے انسان کو اخلاق کی نمائش کرنے ہی کے لئے پیدا کیا ہے اسی بنا پر انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیل اخلاق قرار دیا اور وہ خود بھی دنیا کے منظر عام پر نمایاں ہوئے اور اپنی امت کو بھی نمایاں کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مقصد کے لئے ایک "وادی غیر ذرع" کو منتخب فرمایا اور اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کائنات عالم کے ہر میدان میں اپنا اور اپنی امت کا اسوہ حسنہ پیش کر دیا۔ اسلام نے اسی اصول کی بنا پر رہبانیت کو ناجائز قرار دیا کیونکہ انسان کا اخلاقی جوہر بھی دنیا کی دوسری قوتوں کی طرح تصادم و

کشمکش ہی کے ذریعہ نمایاں ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کو اخلاق حسنہ کا مظہر بنایا ہے اس لیئے اس نے ایسے اسلوب مہیا کر دیئے جو انسان کے حاشیۂ اخلاقی کو ہر وقت نمایاں کرتے رہتے ہیں اگر ایک شخص گھر میں ہے تو اعزا و اقارب کے تعلقات سے اس کے اخلاق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اگر بزم احباب میں ہے تو دوستوں کے اختلاط و ارتباط کو اس کے اخلاق کا معیار بنایا جا سکتا ہے اگر وہ کسی بازار میں ہے تو معاملات کے ذریعہ سے اس کے عیب و ہنر نمایاں ہو سکتے ہیں۔

لیکن جنگ ایک ایسی سخت ٹھوکر ہے ایک ایسا سخت زلزلہ ہے ایک ایسا سخت دھماکا ہے جس سے دنیا کا ایک ایک ذرہ جنبش میں آجاتا ہے اور اس کی تمام قوتیں دفعۃً متحرک ہو جاتی ہیں۔

اخلاق بھی ایک عظیم الشان قوت ہے اس لیئے وہ بھی جنگ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے اور اس کے اثر سے انسان کے نظام اخلاق میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے یہی علت ہے کہ اسلام نے اپنے تمام اعمال تربیت کے لیئے اخلاقی موثرات میں سے صرف جہاد ہی کو منتخب کیا کیونکہ اخلاقی انقلاب کا اس سے زیادہ کوئی موثر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

زمانہ جنگ میں عارضی طور پر انسان کا نظام اخلاق دفعۃً بدل جاتا ہے یہانتک کہ عیب ہنر اور ہنر عیب ہو جاتا ہے۔ تجسس ایک سخت بد اخلاقی ہے لیکن زمانۂ جنگ میں جاسوسی ایک ہنر خیال کی جاتی ہے اور اس کے لیئے بہترین قابلیت کے اشخاص منتخب کیئے جاتے ہیں صیانت نفس ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے لیکن میدان جنگ میں فرار انتہا درجہ کی بد اخلاقی سمجھی جاتی ہے محاسن اخلاقی میں رحمدلی سے بڑھکر کوئی چیز نہیں لیکن صف دشمن میں اس کی کوئی قدردانی نہیں کی جاتی غیروں کے

حقوق کی حفاظت تمدن و قانون کا بہترین کارنامہ ہے لیکن زمانہ جنگ میں قانون ہی غیروں کے ملک کا دوسری سلطنتوں کے ساتھ الحاق کر دیتا ہے اور مال غنیمت جس طرح وحشی قوموں کے لئے ذریعہ معاش تھا اسی طرح تمدن کا بھی بہترین اندوختہ بن جاتا ہے امن کی حالت میں عفو و درگذر، علم و تحمل اپنے اندر ایک اخلاقی تقناطیسی کشش رکھتے ہیں لیکن صف جنگ میں طلاقت وجہ اور حلم آمیز تبسم سے زیادہ درشت روئی کی قدر کی جاتی ہے۔ کفایت شعاری نہایت عمدہ چیز ہے لیکن میدان جنگ صرف اسراف ہی کے ذریعہ سے فتح ہو سکتا ہے وفاو عہد کی اخلاقی عظمت کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے لیکن زمانہ جنگ میں سینکڑوں بد عہدیاں جائز خیال کی جاتی ہیں

اس قسم کے سینکڑوں اخلاقی عیب و ہنر ہیں جن کی حقیقت زمانہ جنگ میں بالکل بدل جاتی ہے اور ضرورت ان کے بدل دینے پر مجبور کرتی ہے لیکن ابتدا میں دنیا کی ہر چیز عارضی ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے عارضی اسباب سے زمین پر پانی کے قطرے گرتے ہیں اور آہستہ آہستہ زمین میں سوراخ کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن وہ مستقل گڑھے کی صورت اختیار کر لیتا ہے ایک پتھر پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں اور وہ ان کا رنگ جذب کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک معدن لعل شب چراغ کے قالب میں نمایاں ہو کر دنیا کی آنکھ کو خیرہ کر دیتا ہے۔

انسان کے اخلاق و عادات کا بھی یہی حال ہے بچہ ماں کے پیٹ سے ایک سادہ شیشہ دل لے کر آتا ہے۔ جس میں ہر عکس کے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے دنیا کی جو طاقت اس پر اپنا پرتو ڈالتی ہے آہستہ آہستہ اسی اثر کو قبول کرتا جاتا ہے اور اسی قوت کا مجموعی اثر اسکا اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے انسان کے اخلاق کا سب سے بڑا مظہر عادت ہے لیکن یہ ملکہ بھی کسی فعل کے متواتر عمل میں لانے سے

پیدا ہوتا ہے۔

اس عالمگیر قدرتی اصول کی بنا پر جن قوموں کو جغرافیانہ حالت تمدنی ضرورت اور قومی خصوصیات ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رکھتی ہیں وہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ میدان جنگ میں بسر کرتی ہیں یہی عارضی نظام اخلاق ان کا مستقل اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے اور وہ ان اخلاقی خصوصیات میں تمام دنیا سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں ترکوں کی جنگ جوئی عام طور پر ضرب المثل ہے۔ ع

چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغما را

زمانہ جنگ میں جن اخلاق و عادات کو ناگزیر خیال کیا جاتا ہے ان میں بہت سے ایسے ہیں جن سے بلا تکلف بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے جنگ کے لئے اگرچہ جاسوسی ایک ضروری چیز ہے لیکن جاسوس فوج کے ضروری اجزا نہیں ہو سکتے میدان جنگ میں کبھی کبھی دشمن پر رحم بھی کیا جا سکتا ہے فقر و فاقہ کی حالت میں بھی جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے اور دولت کی بارش اس کے لئے ضروری نہیں لیکن "شجاعت" ایک ایسی چیز ہے جو جنگ کی حقیقت میں داخل ہے اور اگر کوئی شخص میدان میں عزم و استقلال کے ساتھ کھڑا رہنا چاہتا ہے تو اس کو سب سے پہلے اپنے پاؤں میں اس کی سنہری زنجیر ڈال لینی چاہئے۔

جن قوموں کو کسی اتفاقی ضرورت سے لڑنا پڑتا ہے اگرچہ ان کے لئے ایسی شجاعت نہایت ضروری ہے لیکن جو قومیں ہمیشہ لڑتی بھڑتی رہتی ہیں انہیں شجاعت کا ایک مخصوص ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے وہ خاص طور پر اس وصف میں دوسری قوموں سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں۔

مرد عورتوں سے زیادہ بہادر ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے مختلف لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے یہی کشمکش ان کے

جذبات شجاعت کو زیادہ نمایاں اور مستحکم کر دیتی ہے۔

لیکن اگر متمدن اور وحشی قوموں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں بھی مرد اور عورت کی سی نسبت نظر آئے گی۔ متمدن قوم ایک عظیم الشان شہر کی چار دیواری میں محصور رہتی ہے اس کو خارجی خطرات کا بالکل ڈر نہیں رہتا شہر کے اندر پولیس حفاظت کرتی ہے وہ امن و سکون کی حالت میں آرام کی نیند سوتی ہے اس طرح رفتہ رفتہ اس کی قوت دماغی بے کار ہو جاتی ہے اور شجاعت کے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایک بدوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے وہ کھلے ہوئے میدان میں رہتا ہے اور اپنی تمام چیزوں کی حفاظت خود ہی کرتا ہے چور ڈاکو غنیم اس پر حملہ کرتے ہیں اور وہ صرف اپنی قوت بازو سے ان کو دفع کرتا ہے اس لئے اس کے جذبۂ شجاعت کو ہمیشہ ٹھوکر لگتی رہتی ہے اور اس سنگ چقماق سے ہمیشہ شرارے نکلتے رہتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے پہلو میں ایک گرم دل اور دل میں گرم خون کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتا ہے یہی خون اس کی رگوں میں ہر وقت حرکت پیدا کرتا رہتا ہے اور وہ ایک معمولی سی صدا پر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

عرب جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کو دفعتًا الٹ دیا اسی قسم کی شجاعت کا مرکز تھا یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بہادروں کا ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو ہمیشہ گھوڑے کی لگام زنار کی طرح اپنے گلے میں آویزاں رکھتا تھا اور ہر وقت میدان جنگ کے لئے پابہ رکاب رہتا تھا فارسی لٹریچر میں پابہ رکاب کے استعارے کو بھی جنگ ہی کی عاجلانہ مستعدیوں نے پیدا کیا۔

لیکن کبھی کبھی صرف ایک ہی ممتد اور عظیم الشان جنگ اس قسم کی مستقل شجاعت پیدا کر دیتی ہے فتح و ظفر کی نشاط انگیز مسرت اس آتش سیال کو اور بھی دو آتشہ بنا دیتی ہے آج ہمیں کئی قومیں ایسی نظر آتی ہیں جو اگرچہ ہمیشہ مصروف جنگ نہیں رہیں لیکن

صرف ایک ہی فاتحانہ جنگی اقدام یا ایک ہی بامراد معرکہ قتال نے ان کو ایک مستقل اور دائم وقائم جنگی قوم بنا دیا ہے۔

تاتاریوں کی مشہور شجاعت بھی اسی عالمگیر طوفان کی ایک موج ہے جو ساتویں صدی میں تمام دنیائے اسلام میں پھیل گیا تھا اور بعد کی صدیوں میں ہجوم اعدا نے اسکو اور بھی مستقل کر دیا۔

اس مستقل شجاعت کا اثر صرف میدان جنگ ہی میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ عمل میں اسی کی جھلک نظر آتی ہے وہ تمام قوم میں ایک حرکت پیدا کر دیتی ہے جو اس کے تمام قوائے خفتہ کو بیدار رکھتی ہے جرمنی کی جنگ پرستی کا نقشہ فرانس و بلجیم کے میدانوں سے زیادہ برلن کے کارخانوں کالجوں عام بازاروں میں نظر آیا تھا۔

قومی کار یہ نشاط قوموں کی افزائش نسل پر نمایاں اثر ڈالتا ہے یہی وجہ ہے کہ شیر کی ابھرنے والی بہادرانہ قوت جب ایک پنجرے میں قید کر دی جاتی ہے تو اسکا شجاعانہ نشاط فنا ہو جاتا ہے اور اس کے توالد و تناسل کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے

اس کے برعکس بزدل قوم قلیل النسل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک مدت کی غلامی کا افسردہ کن امن مفتوح قوموں کو فنا کر دیتی ہے۔

لیکن ایک ہی قوت متضاد نتائج بھی پیدا کر سکتی ہے پانی کی طغیانی اگر سطح دریا پر موجوں کے سر پر غرور کو بلند کر دیتی ہے تو بہت سے سر اٹھانے والے کنگرے اس کی رو میں پست بھی ہو جاتے ہیں اس لئے جنگ اگر ایک قوم کے جذبہ شجاعت کو ہمیشہ کے لئے ابھار دیتی ہے تو دوسری قوم کو ہمیشہ کے لئے بزدل بھی بنا دیتی ہے شخصی حالتوں میں بھی یہ بزدلی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

انگلستان کے مشہور فلاسفر ٹامس ہوب نے اپنی بزدلی کی یہ وجہ بتائی ہے کہ وہ جس زمانہ میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا انگلستان کو ہسپانوی لوگ جنگ دغارتگری

کی دھمکیاں دیتے رہے اور ان کی فوجیں عموماً ساحل انگلستان کا چکر لگایا کرتی تھیں اسوقت تمام انگلستان کے ساتھ اس کی ماں بھی اضطراب وخوف میں مبتلا تھی اس کے اضطراب عصباتی نے بچے میں یہ بزدلی پیدا کردی۔

انگلستان کے سلاطین قدیم میں یعقوب ثانی سخت بزدل تھا اس کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی ماں نے سخت مصیبت واضطراب کی حالت میں زندگی بسر کی تھی اور اس کا قدرتی اثر اس کے بچہ پر بھی پڑا تھا۔

خواجہ حسن نظامی

ان کے مضامین کا مجموعہ سی پارۂ دل کے نام سے شائع ہو چکا ہے
ان کا اسلوب کسی قدر محمد حسین آزاد کے اسلوب سے ملتا ہوا ہے۔ دلی کی
ٹکسالی زبان لکھتے ہیں۔ پیش پا افتادہ موضوعات سے حکمت و
معرفت تصوف اور سیاست معاشرت اور تمدن کے نکتے بیان کرتے
ہیں۔ سیدھے سادے جملوں میں روانی کے ساتھ سوز و گداز ملتا ہے
ایک اچھے مضمون نگار کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جزئیات پر بھی
اگر قلم اٹھاتا ہے تو اپنے افکار سے ان کو مالا مال کر دیتا ہے اور
اپنے اسلوب سے وہ رنگ آمیزی کرتا ہے جس سے قاری بغیر اثر
لیئے نہیں رہتا۔ یہ صفت خواجہ صاحب میں پائی جاتی ہے۔ ذیل میں
ان کا ایک مضمون "الو" دیا جاتا ہے۔

اُلّو

الّو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نحوست کو سب مانتے ہیں ضرب المثل کے جملے بے چارے اس پرندہ کے وجود پر بن گئے ہیں جب کسی گھر یا شہر کی ویرانی بیان کرنی منظور ہو تو کہتے ہیں وہاں تو الو بول رہا ہے یعنی وہ مقام بالکل اجاڑ ہے آبادی کی چہل پہل بالکل نام کو نہیں اور فقط نحوست اور ویرانہ پن ہی میں الو بدنام نہیں ہے حماقت و بے عقلی کے موقعہ پر بھی الّو کا ہی نام لیا جاتا ہے۔ الو کی آواز سے بہت بدشگونیاں منسوب ہیں۔

پس ایسے منحوس جانور کے ذکر اذکار میں کون جی لگائے گا کس کو رغبت ہوگی کہ بلبل ہزار داستاں اور طوطی شکر مقال کے چرچوں کو چھوڑ کر اس بدنام پرندہ کے بیان میں مصروف ہو مگر دنیا کے پردہ پر سب آدمی ایک مزاج اور طبیعت کے نہیں بستے ہزار الو کو برا کہنے والے ہیں تو دو چار اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی نکل آئیں گے خاصکر وہ گروہ جو موجودات کے ہر نیک و بد کو صفات یزدانی کا مظہر تصور کرتا ہے۔

جو لوگ بلند آسمان۔ چمک دار ستاروں۔ روشن آفتاب و ماہتاب لہلہاتے باغوں میں شان غیبی کا ظہور مشاہدہ کرتے ہیں۔ جن کو چشم ستارہ میں جلوۂ راز نظر آتا ہے۔ جو گل کی صورت میں حسن ازل کو دیکھتے ہیں۔ جن کی زبان سے ان نظاروں کو دیکھ کر یہ نکلتا ہے کہ اے خدا تو نے یہ چیزیں فضول نہیں بنائیں وہ پست زمین، اندھیری رات، سنسان بیابان۔ نگاہ مغموم اور نوکدار کانٹوں میں بھی حقیقت کی نمود پاتے ہیں اور ہر چیز میں خدا کی شان نظر آتی ہے۔

لہذا کوئی وجہ نہیں کہ اس جماعت کے رسالہ میں جس کا مشرب ہمہ اوست ہے اور جو خیر و شر دونوں میں محمل لیلیٰ کے جرس کی صدا سنتے ہیں اُلّو کی سرگزشت نہ لکھی جائے صوفی کی روش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر اچھی بری چیز میں منزل مقصود کو تلاش کرے۔ یہ رسالہ صوفیوں کا ہے اس لیئے اس میں بھی جہاں عام پسند عنوانوں پر مضامین لکھے جاتے ہیں وہاں ان عنوانوں کو بھی زیر بحث لایا جائے جن پر توجہ کرنا قاعدہ اور دستور کی نظر میں قابل نفرت ہے۔

اُلّو کے اوصاف

اُلّو کی زندگی بود و باش ایک با خدا تارک الدنیا درویش کی سی ہے وہ آدمی سے گھبراتا ہے اس کو خلوت تنہائی بھاتی ہے۔ عام پرندوں کی طرح رونق دار شہروں اور غل شور کے مقام پر آشیانہ نہیں بناتا۔ سرسبز درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر نغمہ سنجی نہیں کرتا جس سے فرحت پسند انسان جی بہلائے۔ اُلّو سارا دن حریص پرندوں کی شکل پیٹ کی خاطر در بدر مارا مارا نہیں پھرتا۔ بلکہ وہ اجاڑ اور غیر آباد کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے جہاں کوئی غیر مانوس آواز اس کی مشغولی میں خلل انداز نہ ہو۔ دن بھر سائے میں رہتا ہے اور شام کو سورج چھپنے کے بعد رزق کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اور جونہی نکلا خدا تعالیٰ شکار کے چند لقمے دلوا دیتا ہے۔ جن سے روزہ افطار کر کے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد یا جھکی ہوئی دیوار پر آ بیٹھتا ہے اور "ہو ہو" کے نعرے لگاتا ہے اسی ذکر و شغل اور یاد الٰہی میں صبح ہو جاتی ہے اور یہ پکا اور سچا صوفی ریاکاری کے ڈر سے خاموش ہو کر اپنے حجرہ میں گھس جاتا ہے حبس دم کر کے مراقبہ میں بیٹھ جاتا ہے اور شام تک باہر نہیں آتا۔

یہ خود پسند آدمی بادشاہی کا تاج پہن کر نوبت نقارے بجواتا ہے نوبت خانوں کے لیئے اونچے اونچے مکان تیار کراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ نوبت ہمیشہ بجیگی لیکن زمانہ

کا چکر چند ہی روز میں اس سرکش کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھر دنیا والے اس کو اور اسکے نوبت نقاروں کو بالکل بھول جاتے ہیں مگر اتو نہیں بھولتا مٹنے والے تاجدار کے خاکی ڈھیر پر جاتا ہے اور نقیب اور چوبدار کی آواز کو صدائے عبرت میں مرنے والے کے وجود خاکی کو سناتا ہے اور اس کے نوبت خانہ پر بیٹھ کر ٹھیک رات کے بارہ بجے یہ نوبت بجاتا ہے۔ کہ یہاں کی ہر چیز کو فنا ہے باقی رہنے والی بس خدا کی ایک ذات ہے۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں راقم الحروف درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں حاضر تھا پچھلی رات جب کہ چاند غروب ہو رہا تھا جی چاہا کہ قطب مینار کا نظارہ کروں اس وقت عجیب پر اثر وقت تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ درگاہ شریف سے نکل کر مقبرہ ادہم خاں کے قریب آیا تو دسویں رات کے چاند کی صورت سامنے آگئی بیچارہ ماندگی کے عالم میں افق تنزل پر جھک رہا تھا اور اپنی افسردہ شعاعیں ویران در و دیوار پر ڈال رہا تھا۔ بجھی روشنی میں شاہی کھنڈرات کی صورت ایسی ہیبت ناک اور ڈراؤنی معلوم ہوئی کہ کلیجہ کانپنے لگا۔ تاہم ہمت کر کے اور آگے بڑھا جوگ مایا کا مندر دور سے نظر آ رہا تھا دوسری طرف جو پھر کر دیکھا تو غیاث الدین بلبن اور محمد خاں شہید کے شکستہ مقبرے اور بیسیوں اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں جن پر پھیکی پھیکی چاندنی اور رات کی خاموشی نے خبر نہیں کس بلا کا اثر پھیلا رکھا تھا کہ بے اختیاری کی سی حالت پیدا ہو گئی لیکن ارادہ قطب مینار دیکھنے کا تھا ان نظاروں میں تھوڑی دیر مصروف رہ کر آگے بڑھ گیا اور علاء الدین خلجی کے مقبرہ کے پاس پہنچا تو بیچارہ سلطان خلجی اکیلا تنہا خوفناک کھنڈر کی گود میں پڑا سوتا ہے کوئی پہرہ دار نہیں پاسبان نہیں جو اس سکندر ثانی کی خوابگاہ کے قریب جانے سے مجھ اجنبی کو روکے۔ زندگی کی تو خیر

نہیں مرنے کے بعد جب ابن بطوطہ نے اس مقبرہ کو دیکھا تھا تو عجب شان تھی۔ زریں مخملی غلاف پڑے ہوئے تھے اگر اور لوبان کی خوشبو سے مقبرہ مہک رہا تھا عالیشان گنبد کے قریب بہت بڑا مدرسہ تھا جہاں سینکڑوں طلبا علوم دفنوں حاصل کرتے تھے۔

آج کی رات نہ گنبد باقی تھا نہ غلاف۔ نہ خوشبو نہ مدرسہ نہ طلبا۔ یہاں تک کہ قبر کا نشان بھی ناپید تھا چونے اور پتھروں کے انبار میں خبر نہیں کہ کس جگہ سکندر ثانی سلطان علاء الدین خلجی کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ اس منظر نے میرے پاؤں پکڑ لیے بدن ساکن کر دیا۔ آنکھوں کو دریائے عبرت میں غرق کر دیا۔ محو حیرت بنا کھڑا تھا کہ سامنے کی شکستہ دیوار پر سے الو کی صدا کان میں آئی جو سلطان کی گزشتہ شان و شوکت کا نوحہ رک رک کر پڑھ رہا تھا۔

ان سب پر اثر نظاروں سے زیادہ میرے دل پر صدائے بوم کی چوٹ لگی۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت کیا حالت ہوئی اور اب جب اس کا خیال کرتا ہوں کیا کیفیت دل کی ہو جاتی ہے تو کیا ایسے ناصح اور بیکسوں کے دمساز جانور کو آپ برا کہہ سکتے ہیں؟ اگر اس کی محل شناسی پر غور کیا جائے تو بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے جن کو سب بھول گئے جن کو سب نے چھوڑ دیا ان کو الو نے نہیں بھلایا اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ الو کی آواز کو منحوس ناحق کہتے ہیں ذرا دھیان سے سنو اللہ ہو صاف سمجھ میں آئے گا۔ بعض دفعہ ہو ہو کہتا ہے اور بعض وقت پورا اللہ ہو پکارتا ہے بنگالی مینا۔ ہیرامن طوطا اور یہ ننھی ننھی خوبصورت چڑیاں میٹھی میٹھی بولیوں سے آپ کا جی خوش کرتی ہیں مگر الو اپنے نعرہ حق سے آپ کے دل کو لرزا دیتا ہے۔ اس لئے آپ اس کو منحوس کہتے ہیں۔ نہیں نہیں ایسا خیال نہ کرو یہ خوش نوا پرندے دل کو یاد حق سے ہٹا کر تکلفات دنیا میں مصروف کرتے ہیں اور الو کی

جگر خراش فریاد انجام حیات کو یاد دلاتی ہے اور کہتی ہے۔

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

آج سے آپ کو چاہیئے کہ الّو کی نحوست کا خیال چھوڑ کے اس کی خوبیوں پر نظر کیا کیجئے الّو پر کیا منحصر ہے عالم موجودات میں جو شئے نظر سے گزرے اچھی ہو یا بری اس کے اچھے معنی نکالنے چاہئیں۔

پیارے لال شاکر

'چراغ' کے عنوان سے جو مضمون ذیل میں درج کیا جاتا ہے یہ پیارے لال شاکر کے مجموعہ مضامین 'مفید ایجادات کی کہانی' سے ماخوذ ہے یہ ایک سائنٹفک تحقیقاتی مضمون ہے جس کی زبان سادہ صاف اور معلمانہ ہے ذیل کے مضمون سے معلوم ہوگا کہ ہماری راتوں کو روشن بنانے والا چراغ ابتدائے تہذیب سے اسوقت تک کتنے فانوس تبدیل کر چکا ہے اور انسان نے کس کس طرح اندھیرے کو اجالے سے بدلا ہے۔ پیارے لال شاکر نام کے اعتبار سے ہندو تخلص کے اعتبار سے مسلمان اور مذہبا عیسائی تھے آپ 'العصر' کے ایڈیٹر تھے۔

چراغ

جسم کو گرمی پہنچانے اور کھانا پکانے کے علاوہ آگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی روشنی تاریکی کو مٹاتی ہے تم جانتے ہو کہ انسان پرندوں کی طرح مجبول کبھی نہیں رہا کہ آفتاب کے غروب ہوتے ہی سو جائے بلکہ وہ رات کا بھی بہت سا حصہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے معاشری مسرتوں میں اضافہ ہوتا یا قوائے دماغی کو تقویت پہنچتی ہے اور اس طریقہ سے گویا اس کی زندگی بڑھتی ہے لیکن اگر انسان تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا ہوتا تو وہ کچھ نہ کر سکتا لہٰذا جب روشنی کا خاص ذریعہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو اس کو بطور خود روشنی مہیا کرنا چاہئے چاند اور ستاروں کی مدھم روشنی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس میں کوئی کام کیا جاسکے اس کہانی میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان تاریکی پر کیونکر غالب آیا۔ اسی ضمن میں چراغ کے وجود میں آنے کی کیفیت بھی معلوم ہو جاوے گی۔

انسان کا سب سے پہلا چراغ جگنو ہے۔ انسان کو ابتدائی زمانہ میں رات کے وقت اسی سے روشنی ملتی رہی ہے۔ جگنوؤں کو ناریل یا تونبی میں بند کر دیا جاتا تھا ناریل یا تونبی میں چاروں طرف بکثرت سوراخ ہوتے تھے۔ جن سے جگنوؤں کی روشنی آتی رہتی تھی۔ ان ننھے کیڑوں کی روشنی کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ ایک سیاح کا بیان ہے کہ میں نے کوہستان تحوکا میں اس قدرتی چراغ کی روشنی میں باریک سے باریک حروف بآسانی پڑھ سکا ہوں۔ شیشہ کے گلاس کو اوندھا کر کے اسکے نیچے دو تین جگنو بند کر دینے سے اتنی روشنی ہو جاتی تھی کہ میں رات کو اپنی چھوٹی سی گھڑی میں نہ صرف وقت دیکھ سکتا تھا بلکہ سکنڈ کی سوئی کے نشانات بھی صفائی

سے نظر آجاتے تھے۔

اگرچہ ابتدائی زمانہ میں روئے زمین کے ابتدائی باشندوں نے کہیں کہیں جگنوؤں سے کام لیا ہے تاہم اس کو اول چراغ نہیں کیا جاسکتا سچ پوچھو تو انسان کا اول چراغ لکڑی کی وہ چھڑی تھی جو روشنی کی غرض سے غار کی آگ سے روشن کرلی جاتی تھی وہ گویا مشعل کی ابتدائی صورت تھی۔ مشعل کی ترقی کا پہلا قدم وہ تھا جبکہ وہ کسی ایسے درخت کی لکڑیوں یا کھپاچوں سے بنائی گئی ہوگی جس میں تیل یا چربے کا جزو تھا اس دریافت سے روشنی زیادہ صاف اور پائدار ہوگئی۔ مزید ترقی اس وقت ہوئی جبکہ موم یا کسی قسم کی چربی پتوں پر مل کر یہ مشعل پر لپیٹ دیئے گئے اب اس مشعل نے شمع کی حیثیت اختیار کرلی تھی صرف اتنا فرق تھا کہ بتی (پتے) باہر کی طرف تھی اور روغنی مادہ درمیان میں۔

کچھ مدت گزرنے پر یہ دریافت ہوا کہ جلائی جانے والی چیز (چھڑی وغیرہ) کے چاروں طرف اگر چکنائی پوت دی جائے تو روشنی زیادہ اچھی اور صاف ہوتی ہے مطلب یہ کہ بتی اندر ہوجائے۔ اب کیا تھا رسوں کی مشعلیں بننے لگیں رسوں پر چربا یا چربی مل دی جاتی تھی۔ اسی طرح اگر چھڑیوں یا کھپاچوں کی مشعل بنائی جاتی تھی تو اس پر بھی چربی یا کسی اور چکنائی کی موٹی تہ چڑھائی دی جاتی تھی۔ یہ رسے یا چھڑیاں آج کل کی شمع کی بتی کا کام دیتی تھیں اور چربی موم یا پیرافن کا۔ اس قسم کی مشعلیں ابتدائی زمانہ ہی میں بننے لگی تھیں اور ہزارہا برس تک باقاعدہ استعمال میں آتی رہیں حتی کہ جب انسان تہذیب یافتہ ہوگیا تو اس وقت بھی مشعلوں سے کام لیتا رہا۔ تاریک زمانہ میں جس کو حقیقی معنوں میں تاریک کہا جاسکتا ہے لوگ درمیانی چھڑی کے اردگرد درختوں کے ریشے چھال وغیرہ لپیٹتے تھے۔ بعد ازاں اس پر چربی کی موٹی تہ چڑھانے لگے۔ اس مشعل کی روشنی بہت صاف ہوتی تھی الفریڈ اعظم

سنہ ۱۹ء کے وقت میں ترقی کا ایک اور قدم بڑھا یعنی درمیانی چھڑی کو بالکل جواب دے دیا گیا اب سوت کی بتی بٹ کر اس پر چربی یا لاکھ کی موٹی تہ چڑھائی جانے لگی لکڑی کی چھڑی جو گویا ابتدائی مشعل کی یادگار تھی بالکل خارج کردی گئی۔ اس تبدیلی کے باعث مشعل نے شمع کی صورت اختیار کرلی۔ آج کل کی موم بتیوں میں پرانے زمانے کے مقابلہ میں بہترین سامان لگایا جاتا ہے اور اس وقت کے بہ نسبت اب ارزاں بھی ہوتی ہیں لیکن باوجودیکہ ہزارہا برس گزر چکے ہیں لیکن ان میں اب بھی وہی اصول کام کر رہا ہے۔

ہم نے سب سے پہلے شمع کی ترقیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ پہلے پہل روشنی کے لئے لکڑی کے مشعل کندے استعمال ہوتے تھے اور ہم بتا چکے ہیں کہ ان کندوں نے رفتہ رفتہ شمع کی صورت اختیار کرلی لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ روشنی کے لئے مشعل کندوں کے ساتھ ایک اور بھی چراغ مستعمل تھا جب انسان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوگیا کہ جانوروں کی پگھلی ہوئی چربی باآسانی جلنے لگتی ہے تو اس نے ایک قسم کا چراغ بنایا جس کی بتدریج ترقی یافتہ صورت زمانہ حال کے لیمپ ہیں سنکھ کا خول یا کسی جانور کی کھوپڑی میں پگھلی ہوئی چربی بھر دی جاتی تھی اور بتی کی جگہ کسی درخت کے ریشے بٹ کر ڈال دیئے جاتے تھے یہی سب سے پہلا چراغ تھا جیسے جیسے انسان تہذیب یافتہ ہوتا گیا سنکھ یا کھوپڑی کے بجائے مٹی کے دیئے یا پیالے استعمال ہونے لگے۔ ان چراغوں کے کنارے پر ایک طرف بتی کے لئے گھر بنا دیا جاتا تھا جس میں بتی لٹکی رہتی تھی۔ ہندوستان کے دیہات میں اب تک زیادہ تر مٹی کے دیئے ہی استعمال ہوتے ہیں جن میں بالعموم سرسوں کا تیل جلایا جاتا ہے کہیں کہیں ارنڈ کا تیل نیم کا تیل مونگ پھلی کا تیل وغیرہ بھی استعمال کئے جاتے ہیں دیوالی کے موقع پر جو چراغاں ہوتا ہے اس میں بالعموم مٹی کے دیئے ہی استعمال

کئے جاتے ہیں۔

قدیم یونانیوں اور رومیوں میں جو لیمپ استعمال ہوتے تھے ان کی صورت شکل بہت کچھ فانوس سے ملتی جلتی تھی ان میں تیل کی کپی بند ہوتی تھی اور وسط میں ایک سوراخ ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے تیل بھر دیا جاتا تھا بعض اوقات ان لیمپوں میں ایک درجن یا اس سے زیادہ چراغ ہوتے تھے جن میں الگ الگ بتی ڈال دی جاتی تھی ظاہر ہے کہ جتنی زیادہ بتیاں استعمال ہوں گی اسی قدر روشنی بھی زیادہ ہوگی اٹلی کے مقام کارٹونہ کے عجائب گھر میں قدیم زمانہ کا ایک لیمپ موجود ہے جس میں الگ الگ سولہ بتیاں ہیں یہ عجیب وغریب لیمپ آج سے ڈھائی یونے تین ہزار برس قبل اترودیہ کے ایک بت خانہ میں روشن ہوتا تھا۔

اس قسم کے لیمپ زمانہ قدیم میں مہذب طبقہ میں استعمال ہوتے تھے اور وہ نہ صرف وسطیٰ زمانہ تک استعمال ہوتے رہے بلکہ زمانہ حال میں بھی استعمال ہوتے ہیں بعض اوقات یہ لیمپ بہت قیمتی اور بہت خوبصورت ہوتے تھے لیکن ان کی روشنی زیادہ نہ ہوتی تھی بلکہ تیل کی ناگوار بو اڑتی تھی اور دھواں بھی کافی ہوتا تھا جس کے باعث دیواروں اور گھر کے سامان پر کاجل جم جاتا تھا قدیم زمانہ کے لیمپ کے مقابلہ میں شمع بدرجہا بہتر تھی لیکن جب تیرھویں صدی میں موم بتیاں ایجاد ہوگئیں تو جو لوگ ان کو خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے وہ انھیں کو استعمال کرنے لگے مگر عامۃ الناس بدستور انھیں لیمپوں سے کام لیتے رہے اگرچہ لیمپ بڑے کام کی چیز تھی تاہم اس کی وضع وساخت میں کچھ زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں حتیٰ کہ ہوتے ہوتے اٹھارھویں صدی بھی قریب قریب ختم ہوگئی مگر لیمپ ہنوز ناقابل اطمینان تھا آخر اٹھارھویں صدی کے آخری ربع میں لیمپوں میں بھی اصلاح ہوئی ۱۷۸۲ء میں آرگنڈ نامی ایک ڈاکٹر نے جو سوئزرلینڈ کا باشندہ اور لندن میں اقامت گزیں

تھا ایک لیمپ ایجاد کیا جو اس وقت تک کے تمام لیمپوں سے بدرجہا افضل تھا
آرگنڈ نے لیمپ میں کیا اصلاح کی کسی معمولی لیمپ کو دیکھو جس میں مٹی کا تیل جلتا
ہے اس لیمپ کی چمنی بتی کی لو کو ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رکھتی ہے نیز اسی کے
ذریعہ سے ہوا کی آمد و رفت بھی ہوتی ہے آرگنڈ نے اپنے لیمپ میں اسی اصول کو
مدنظر رکھا تھا جو انگیٹھی کی چمنی میں تھا لیمپ کی چمنی کے زیریں حصہ کو غور سے
دیکھو گے تو تم کو نظر آجائے گا کہ ہوا کی آمد و رفت کے لئے راستہ موجود ہے جس کے
ذریعہ سے گزر کر وہ بتی تک پہنچتی ہے اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ چونکہ ہوا
اوپر کو چڑھتی ہے لہذا لیمپ کی ساخت میں اس امر کو بھی مدنظر رکھا گیا کہ لیمپ
کے روشن رہتے وقت اس کی بتی کو زیادہ سے زیادہ ہوا لگے۔ یہ بات خاص
طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے زمانہ کے لیمپوں کی بتی یہ چپٹی یا گول نیز پتلی ہوتی
ہے پتلی بتی کے دونوں اطراف میں خوب ہوا لگتی ہے جس کے باعث بتی دھواں
دئے بغیر عمدگی سے جلتی ہے دھواں کچھ اور نہیں ہوتا کسی جلنے والی شے کے ادھ جلے
ذرات (کاجل) کا نام دھواں ہے جب بتی کو کافی ہوا نہیں پہنچتی تو یہ ادھ جلے
ذرات اڑنے لگتے ہیں آرگنڈ نے بتی کو بہت پتلا بنایا تاکہ اس کی لو میں سے
کافی ہوا گزر سکے اور جب بتی میں سے کافی ہوا گزرے گی تو اس کی لو صاف و
شفاف ہوگی۔

آرگنڈ کی ایجاد کے بعد لیمپ سازی کے فن میں بے حد ترقی ہوئی آرگنڈ کی
ایجاد کے بیس برس کے بعد اس فن میں اتنی ترقیاں ہوئیں کہ اس سے قبل بیس صدی
میں نہ ہوئی تھیں نئے نئے برنر (Burner) لیمپ کا وہ حصہ جس میں بتی ڈالی جاتی
ہے اور جس پر چمنی جمائی جاتی ہے) ایجاد ہوئے۔ عمدہ بتیاں بنائی گئیں اور بہترین
تیل استعمال ہونے لگے لیکن تمام جدید لیمپوں میں اسی اصول سے کام لیا گیا جس کو

آرگنڈ نے قائم کیا تھا جو لیمپ تمھارے گھر میں رات کو روشن کیا جاتا ہے ممکن ہے کہ وہ آرگنڈ کا ایجاد کردہ نہ ہو تاہم اس میں بھی وہی اصول کام کر رہا ہے جس کو سوئزرلینڈ کے اس ڈاکٹر نے ۱۷۸۲ء میں قائم کیا تھا۔

آرگنڈ کے لیمپ کی ایجاد کے بعد اسکاٹ لینڈ کے ایک اور موجد مسمی ولیم مرڈک نے گھر کو روشن کرنے کا دنیا کو ایک جدید طریقہ دکھایا۔ لوگوں کو مدت سے یہ حقیقت معلوم تھی کہ جب چربی یا کوئلہ جلتا ہے تو ان میں سے جو اجزات (یا گیس) اٹھتے ہیں وہ جلتے وقت بہت صاف روشنی دیتے ہیں فی الحقیقت یہ جلنے والی چیز گیس ہی ہوتی ہے چربی یا کوئلہ نہیں ہوتا۔ شمع یا لیمپ کی لو موم یا تیل کو حرارت پہنچاتی ہے جس کے باعث موم یا تیل بتی میں آتا ہے اور تب اس میں گیس پیدا ہوتی ہے ۱۷۹۲ء میں مرڈک نے اس گیس سے بہت عمدہ کام لیا اس نے ایک بڑے برتن میں کوئلے دہکائے اور گیس کو مختلف نلوں اور نلکیوں کے ذریعہ سے اپنے مکان کے ہر حصہ میں پہنچایا اپنے مکان میں جہاں کہیں وہ روشنی کرنا چاہتا تھا وہاں گیس کو نکلنے یا خارج ہونے کا موقع دیتا تھا (یعنی نلکی کی ڈھبری کھول دیتا تھا) اس نے اپنے گھر میں جابجا اس قسم کی نلکیاں لگا رکھی تھیں جن سے وہ لیمپ کا کام لیتا تھا اس تجربہ کے بعد مرڈک نے ہر جگہ گیس کی روشنی پہنچا دی۔ رفتہ رفتہ جب کم خرچ میں گیس پیدا کرنے کا طریقہ معلوم ہوگیا تو سارا شہر گیس کی روشنی سے بقعہ نور بن گیا۔ چنانچہ ۱۸۱۸ء میں شہر لندن کا بیشتر حصہ گیس کی روشنی سے منور ہوتا تھا امریکہ میں سب سے پہلے بالٹیمور میں گیس کی روشنی ہوئی یہ ۱۸۲۱ء کا واقعہ ہے۔

گیس کی روشنی بہت مقبول ہوئی حتی کہ جو لوگ اسکو استعمال کرنے کی استطاعت رکھتے تھے انھوں نے بہتر سے بہتر لیمپوں پر اسی کو ترجیح دی۔ لیکن ۱۸۷۶ء میں ایک اور جدید روشنی دریافت ہوئی یہ بجلی کی روشنی تھی سب سے پہلے جو برقی لیمپ ایجاد

ہوا تھا اس کی روشنی گیس کے ایک سو لیمپوں اور تیل کے کئی سو لیمپوں سے زیادہ تھی سڑکوں اور گلیوں کو روشن کرنے کے لیئے تو یہ بہت موزوں روشنی تھی لیکن گھروں میں اس سے کام نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ اس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں مگر کچھ دنوں بعد بجلی کی روشنی میں بھی ایسی اصلاحیں ہوگئیں کہ اس سے ہر جگہ کام لیا جا سکتا تھا ہمارا اشارہ بجلی کے ان قمقموں کی طرف ہے. جو اب ہر جگہ نظر آتے ہیں یوں تو لوگوں کو بہت پہلے سے یہ علم تھا کہ بجلی سے روشنی کا کام لیا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں مختلف حضرات نے ایک حد تک کامیاب تجربات بھی کیئے لیکن مسٹر ٹامس ایلوا ایڈیسن نے اس روشنی کو اس قدر عام کر دیا کہ اب ہندوستان میں بھی ہر طرف بجلی ہی بجلی نظر آتی ہے۔

مشعل شمع۔ لیمپ گیس کی روشنی اور برقی قمقمے۔ یہ لیمپ کی ترقی کے قدم ہیں اب ذرا خیال کرو کہ چراغ کے سلسلہ میں انسان نے کیسی کیسی ترقیاں کیں اور کیونکر تاریکی پر غالب آگیا شروع شروع میں لکڑی کی چھپڑی جلائی جاتی تھی جس کی روشنی بہت مدھم ہوتی تھی اور جس سے اس قدر دھواں اٹھتا تھا کہ غار کاجل سے سیاہ ہوجاتی تھی اور یا اب یہ حال ہے کہ ایک بٹن کو دبایا نہیں کہ گھر بقعہ نور بن گیا نہ دھوئیں اور کاجل کا اندیشہ ہے نہ گیس کی ضرر رسانی کا خدشہ۔

کیا روشنی کے سلسلہ میں کوئی اور ایجاد ممکن ہے؟ کیا کوئی اور ایسا طریقہ روشنی دریافت ہوگا جو برقی روشنی پر سبقت لے جائے۔ زمانہ بتائے گا کہ یہ ممکن ہے۔

رشید احمد صدیقی

سودا اور انشا نے نظم میں ہجو لکھی لیکن اس کا مقصد محض تفریح تھا اکبر الہ آبادی نے ظرافت سے اصلاح کا کام لیا اور مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا نثر میں بھی مضحکہ مضامین لکھنے والے اودھ پنچ کے مضامین نگار اور ان کے بعد بھی شوکت تھانوی اور پطرس بخاری ہیں رشید صدیقی کے یہاں ظرافت کم اور طنز زیادہ ہے رشید صدیقی کا دماغ بقول علی عباس حسینی بھان متی کا پٹارا ہے جس کے اندر سب کچھ موجود ہے اور ایک جنبش قلم میں آسمان وزمیں کی مسافت طے کر جاتا ہے۔ اور کس کس پر اپنا ہاتھ صاف کر جاتا ہے قاری کے دماغ میں ایک کھلبلی مچ جاتی ہے الفاظ کی بازیگری بھی ہوتی ہے اور طنز کی نشتریت بھی۔ وہ سماج کے لئے ایک جراح بھی ہے اور اس کی تشخیص مرہم زخم جگر بھی۔ رشید نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں نمونہ کے لئے ذیل میں مضمون درج کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے "شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے"

شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے

سیدھا سادھا جواب تو یہ ہے کہ کوئی معنی نہیں رکھتا گو معنی نہ رکھنا بھی بعضوں کے نزدیک بڑی پر معنی بات ہے ایسوں سے نباہ بڑا مشکل ہے لیکن ان میں مجھ میں فاصلہ اتنا ہے کہ خواہ مخواہ ڈرنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔

شاعر کی تقسیم بڑی مشکل ہے اس کو جنس کے اعتبار سے نہیں تقسیم کر سکتے اسلئے کہ اس کی جنس ہمیشہ مشتبہ رہی ہے جوان بوڑھے کے اعتبار سے بھی تقسیم نہیں کر سکتے کیونکہ آج کل کا شاعر منھ زور ہونے کے اعتبار سے جوان خیالات کے اعتبار سے بوڑھا اور اعمال کے اعتبار سے کچھ غیر جانب دار سا ہوتا ہے اور یہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے میں آپ کا وقت ضائع کرنے کی کوشش کروں ایک تقسیم جثہ اور حلیہ کے اعتبار سے بھی کی جا سکتی ہے لیکن اس میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ آپ کو ہر جثہ اور ہر حلیہ کے شاعر ملیں گے میں نے ایسے بھی شاعر دیکھے ہیں جن میں عرض و طول ہے حجم نہیں اور ایسے بھی جن میں حجم ہی حجم ہے طول و عرض کا گزر نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ آئن اسٹائن کے مشہور نظریہ اضافیت سے واقف ہیں یا نہیں اور یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ میں خود واقف نہیں ہوں آپ بھی واقف نہ ہوں تو پھر بڑی سہولت ہوگی یعنی نظریہ تو رہا الگ البتہ ہم آپ ایک دوسرے سے خوب واقف ہو جائیں گے۔

آئن اسٹائن کے نظریہ کی ضمن میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ فاصلہ اور رفتار کے اعتبار سے طول و عرض کا تصور بدل جاتا ہے چنانچہ آپ نے بعض ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو اپنے اشعار کچھ اس دھن سے پڑھتے ہیں کہ آپ ان کے

صحیح رقبہ کا اندازہ نہیں کر سکتے میں نے ایک شاعر کو غزل اس طور پر پڑھتے دیکھا ہے گویا غزل کے معنی عورتوں سے بات کرنے کے نہیں ہیں بلکہ X ٥ انجنوں پر دانت پیسنے کے ہیں۔

اچھا آئیے ذرا سنجیدگی سے اس مضمون کی "تقطیع" کر ڈالیں یہ کوئی اندیشہ ناک بات نہیں ہے بشرطیکہ سنجیدگی اپنی ہو اور تقطیع دوسروں کی۔ دنیا میں ہر شخص کھلونے کھیلتا ہے کھلونوں اور کھلاڑیوں کا شمار نہیں۔ شاعر الفاظ سے کھیلتا ہے مصور رنگ اور خط سے۔ مجسمہ تراش پتھر سے رقاص حرکت سے سیاست داں قوم سے لیڈر جھنڈا سے یونیورسٹیاں تعلیم یافتوں سے تعلیم یافتہ بیکاری سے۔ بیکاری انقلاب سے انقلاب زندہ باد سے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ خود الفاظ کی دنیا بھی دلچسپی سے خالی نہیں اور اس میں ہمارے شاعر کو بہت کچھ دخل ہے الفاظ کی اہمیت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ تعزیرات ہند اور نقش سلیمانی دونوں کا مدار اسی پر ہے قانون اور تعویذ سے کون آزاد رہ سکتا ہے تعزیرات ہند کی رو سے سزا ملتی ہے نقش سلیمانی سے محبوب بہر حال الفاظ کو معنی سے کیا نسبت ہے اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ خود الفاظ کو کیسی جامعیت نصیب ہو چکی ہے اور ہم آپ اس سے نت کیسے نئے نئے شگوفے کھلایا کرتے ہیں۔

شاعر کا سارا کھیل الفاظ سے ہے اس کھیل کو ہمارے شعرا نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ میں وہ باتیں پیدا ہو گئی ہیں جو کبھی معنی میں نہیں تھیں پہلے معنی کے لیے الفاظ کی تلاش تھی اب الفاظ تلاش کر لیجیے معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے کبھی معنی کے لئے سرگرداں رہتے تھے بڑی ریاضت بڑی مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں ان کو ادھر ادھر کرتے رہیے ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے

اور جو بچ رہیں گے ان کو سامعین پورا کر دیں گے۔

آج کل کے بیشتر شاعروں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ انھیں صرف الفاظ یاد ہیں جن کو وہ جس طرح چاہتے ہیں ترتیب دیتے ہیں بعض حالتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جب بحروں اور ترکیبوں کی چرخ پر خود بخود الفاظ آجاتے ہیں جن کے لانے میں شاعر کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا یعنی تو سامعین کی شعریت خود ہی پیدا کر لیتی ہے شاعر کا فرض صرف الفاظ کی ترتیب و بندش ہی نہیں ہے اور نہ صرف وہ خیالات ہیں جن کی وہ الفاظ ترجمانی کرتے ہیں سننے والوں میں بھی شاعر موجود ہوتا ہے۔

یہاں شاعر سے مراد کوئی خاص شخص نہیں ہے جس کا ایک تخلص ہو یا جس کا ایک خاص طرح کا حلیہ یا مشتبہ قسم کی صحت ہوتی ہے بلکہ وہ شعریت ہے جو سننے والے میں موجود ہوتی ہے حقیقی شاعر اپنے سامعین کے دل و دماغ کے تاثرات کو بھی جذبات یا تخیل کا جزو بنا لیتا ہے ایسا نہ ہو تو پھر کسی دواساز یا شاعر میں فرق کیا رہ جائے جو ہمیشہ چند ادویات ملا کر عرق سفوف یا معجون تیار کر سکتا ہے۔

حالانکہ آپ نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو شاعر بالکل نہیں صرف دواساز ہوتے ہیں یہ آپ کے دیکھتے دیکھتے غزل ہی نہیں بلکہ ایک نشست میں پورا دیوان مرتب کر دیں گے ان کے اشعار کلیۃً شعر سازی کے اتفاقی یا میکانکی نتائج ہوتے ہیں۔

اچھا اب تصور کیجئے ایسے شاعر کا جسے اطلاع ملی ہے کہ فلاں مقام پر مشاعرہ ہونے والا ہے اور مصرعہ طرح یہ ہے فرض کر لیجئے وہ ایسے خوش قسمتوں میں نہیں ہے جس کو تیسرے درجہ کا بھی سفر خرچ مل سکتا ہے وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر مصرعہ طرح پر زور دگانا شروع کر دے گا اس درمیان میں اس کو متعلق یہ فکر نہ ہوگی کہ بیوی بچوں کو پیٹ بھرنے کو روزی اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسر ہے یا نہیں نہ

دن کو دن سمجھے گا۔ رات کو رات بھوک پیاس سے کوئی علاقہ نہیں دوست دشمن سب سے بے نیاز۔ تخیل کے زور سے آسمان پر چڑھ جائے گا۔

شفق سے عبیر اور سپیدۂ سحر سے کافور اڑاتا سورج سے رخسار محبوب کی سیر کرتا ثریا کی مانگ سے افشاں چراتا زہرہ کی تان اڑاتا مریخ سے گھبراتا قاضی فلک سے گلچھپ کرتا اوروں پر مسکراتا فرشتوں سے آنکھ ملاتا حوروں کو ورغلاتا رضوان سے لڑتا مالک سے کتراتا قلم سے لکھتا لوح کو پڑھتا طوبیٰ و سدرہ پر جھولتا کوثر و تسنیم میں ڈبکیاں لگاتا جبرئیل کو صید زبوں بناتا اسرافیل سے سرگوشیاں کرتا میکائیل سے دانہ بدلتا عزرائیل سے بچتا پرتو خور سے شبنم کو فنا کی تعلیم دیتا یک لخت پاتال پہنچ جاتا ہے وہاں کبھی خاک سے پوچھتا ہے کہ اے لئیم تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے لالہ و گل میں نمایاں ہونے سے جو صورتیں بچ رہی تھیں ان سے آداب و تسلیمات کرتا قارون نے راستہ میں جو خزانہ لٹایا تھا اسے ٹھکراتا کسی سوختہ سامان کو فلس ماہی سے شمع روشن کرنے کی ہدایت دیتا ہر موج میں جو صد حلقہ کام نہنگ ہیں انہیں قطرہ کو گہر بنتے یا بگڑتے دیکھتا۔ عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کرتا ساحل کو سفینہ اور سفینہ کو ساحل سے اور دونوں کو سبک ساران ساحل سے ٹکراتا اس دنیا میں آجاتا ہے۔ جہاں اس کی غزل تیار ہو رہی ہے اور بیوی بچے فاقہ کر رہے ہیں

یہاں کی دقت بھی کچھ کم نہیں ہے شعر ہے کہ کسی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر کھڑا ہی نہیں ہوتا کبھی لیلیٰ ملتی ہے تو مجنوں بھاگے جاتے ہیں فرہاد قابو میں آتے ہیں تو جوئے شیر غائب حضرت موسیٰ سے نیاز حاصل ہوتا ہے تو تجلی طور کا پتہ نہیں اور نیل تک رسائی ہوتی ہے تو فرعون ہاتھ نہیں لگتا محمود دیکھتے ہیں تو ایاز غیر حاضر۔ محبوب بے حجاب نظر آتا ہے تو رقیب مسلح ملتا ہے بہار آئی تو زنجیر نہیں۔ ہجر میں مرغ سحر نہیں ملتا تو وصل میں موذن حائل ہو جاتا ہے مے خانہ تک رسائی ہوتی ہے تو معلوم

ہوتا ہے کہ ساقی مہوش کے بجائے لٹھ بند والنٹیر موجود ہیں عالم وحشت میں صحرا کی خاک چھاننے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کو ترقی کے لیے مرغیوں اور پولیسیوں کو بسا دیا گیا ہے داورِ محشر سے نپٹنا چاہتا ہے تو جمعیت اقوام معترض ہوتی ہے۔

ان سب سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برآ ہوتا ہے تو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہے کوئی حرف تقطیع سے گر رہا ہے کہیں الف پٹھ گیا ہے تو کہیں ی دب گئی ہے ایک طرف روزمرہ کا منھ سوجا ہوا ہے تو دوسری طرف محاورہ بپھر گیا ہے زحافات میں تذبذب ہے تو مصرعوں میں شترگربگی کہیں فصاحت سسک رہی ہے تو کہیں بلاغت غرارہی ہے بندش کو سنبھالتے ہیں تو ترکیب کی چولیں ڈھیلی ہوئی جاتی ہیں۔

ان دشواریوں سے کسی نہ کسی طرح نجات ملتی ہے تو غزل لے کر دربار مشاعرہ کی طرف چل کھڑے ہوئے بہلی میں سوار نزلہ زکام میں مبتلا فاقہ کرتے سردی سے اکڑتے مشاعرہ پہنچے جلسہ شروع ہوا ایک نے مصرعہ اٹھایا سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے برسات میں کسی کے بگڑے ہوئے منھ زور اور بے لگام ریڈیو سٹ پر ماسکو سے روس قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے خدا خدا کر کے ایک صاحب کی باری آئی جن کا لہجہ نکیرین کا اور جن کی شاعری عذاب قبر سے مشابہ تھی پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے سے گریز کر رہے ہیں لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکالا جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد سے اب تک میونسپلٹی کے تمام اندراجات فوتی و پیدائش موجود ہیں پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند ہوا اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا دوسرے نے شامیانے کی طنابیں کاٹ دیں جناب صدر سکریٹری مشاعرہ شعرا مصرعہ طرح سب کے سب شامیانے کے نیچے گل حکمت ہو گئے۔

یہ تو ہوا شاعر ہونا۔ لیکن اس سے زیادہ عبرت انگیز شاعر کا میزبان ہونا ہے
شاعر ہمیشہ مشاعرہ کو برا بھلا کہتا آتا ہے لیکن مشاعرہ پر جان دیتا ہے میزبان کو
سب سے زیادہ احتیاط اس امر کی رکھنی پڑتی ہے کہ مہمان کو تنہا نہ چھوڑا جائے برف
پڑ رہی ہو تو اسے نمونیہ کا اندیشہ نہیں آگ برس رہی ہو تو اسے لو لگنے کا خوف
نہیں لیکن اس کی توہین ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی میزبان کو شاعر کے عجیب وغریب
معمولات ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی بلکہ اس کے اناپ شناپ اشعار بھی سننے پڑتے
ہیں اس کو داد اس طور پر دینی چاہئے کہ ایسے اشعار نہ اب تک سنے گئے نہ آئندہ
اس کی توفیق ہوگی شعر سننے اور داد دینے کے خاص خاص آداب مقرر ہیں۔
اول تو فرمائش اس طور پر کیجئے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کی فرزندی میں
دینے جا رہا ہے اور شرم خوف اور تذبذب کی وجہ سے اٹک اٹک کر گفتگو کرتا
ہے یا پھر قرض کے بہانے خیرات مانگ رہا ہے۔
اس کے بعد موصوف "مصرعہ اول" پڑھیں گے اسے آپ اٹھائیں یعنی
دہرا دیں آپ کے بعد ممدوح اس مصرعہ کی تکرار کریں گے اور بعدہٗ دوسرا مصرعہ
پڑھیں گے "مصرعہ ثانی" کا ایک تہائی ختم ہوتے ہی آپ کو اپنی آنکھ کھول اور
منھ پھاڑ لینا چاہئے دو تہائی پر کلمات تحسین ادا کرنے کے لئے آمادہ ہو جایئے اور
بقیہ تہائی کے ختم ہونے سے ذرا پہلے آہ یا واہ کر کے لوٹ جایئے اور ہوش میں
آنے سے پہلے ہی مکرر پڑھنے کی فرمائش کیجئے اس طور پر کوئی دو درجن شعر سنئے اور
بغیر سستائے یا دم لئے چلم بھرنے یا پان لینے گھر میں چلے جایئے مجھے اس قسم کی
سعادتیں اکثر نصیب ہوئی ہیں۔
مگر بد نصیبی سے مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ میں لکھا ہوا مصرعہ بھی آنکھ سے
دیکھ کر اکثر پہلے ہلے میں غلط پڑھ جاتا ہوں چہ جائیکہ مصرعہ اٹھانے کے سلسلہ میں

اسے سنتے ہی دہرا دوں میری اس کمزوری سے اکثر شعرا واقف ہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ انھیں اپنا مصرعہ بھی خاصہ عزیز ہوتا ہے اس لئے مجھے معذور سمجھ کر مصرعہ اٹھانے سے معاف کر دیا گیا ہے۔

بد نصیبی سے ایک بار میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا ان کے ہاں ایک اور معزز بزرگ، بیٹھے ملے دوست نے میری پذیرائی کچھ غیر معمولی مسرت سے کی میرے بیٹھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے زنان خانہ میں چل دیئے کہ یہ فلاں شاعر ہیں آپ ان کا کلام سن کر بے حد مسرور ہوں گے کچھ کہنے سننے بھی نہ پایا تھا کہ شاعر نے آداب و تسلیمات و خلوص و احترام کے ایسے پتھر سے شروع کر دیئے کہ میں کچھ کر نہ سکا اور انھوں نے اپنی بیاض کی شتین گن میری طرف کر دی پہلے تو میں ڈر کے مارے چپ رہا لیکن ان کی آنکھوں میں طیش و لجاجت کے باری باری کچھ ایسے آثار ملے کہ میں بھی داد دینے کے لئے سربکف ہوگیا میں نے ایک ترکیب نکالی وہ مصرعہ کے دو چار الفاظ پڑھ پاتے کہ میں جلدی سے انھیں کو دہرانے لگتا انھوں نے پھر سے مصرعہ شروع کیا اور میں نے پھر سے انھیں الفاظ کو دہرانا شروع کیا۔

کئی دفعہ ان کا اسٹارٹ (ابتدا) بگڑا تو ایک دفعہ الف ہی تو ہو گئے جھلا کر بولے حضرت مصرعہ کو ختم تو ہونے دیجئے، میں نے بھی مری ہوئی آواز سے کہا قبلہ پورا کر لیجئے۔ انھوں نے مصرعہ پڑھ کر میری طرف دیکھا تو میں نے جہاں پہلا فقرہ ختم کیا تھا اسکے آگے کا فقرہ نادانستہ طور پر تھوڑی ترمیم کے بعد پڑھ دیا انھوں نے چیں بہ جبیں ہو کر صحت کر دی میں نے بھی عرق عرق ہو کر صحت کر لی ان کو اطمینان نہیں ہوا اسلئے انھوں نے پورا مصرعہ پڑھ دیا میں نے بھی پڑھ دیا لیکن ذرا رک رک کر جس کی وجہ سے نظم نثر میں تبدیل ہو گئی میرے اس اضطراری قصور پر انھوں نے ایسا نعرہ لگایا کہ میں وہاں سے بھاگا اور میزبان باہر نکل آئے۔

یہ سب تو ہوا لیکن میں اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر کیا بات ہے کہ شاعر اور مشاعرہ ہماری زندگی اور ادب میں اتنا رچ گیا ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ممکن ہے یہ اسی کا فیضان ہو کہ ہم دوسری اہم تحریکوں کو بھی مشاعرہ ہی سمجھنے لگے ہیں وہی اناپ شناپ خیالات جن کو کبھی رقص کر کے کبھی رو کر اور کبھی چیخ کر پیش کرتے ہیں کسی کو گالی دیدی کبھی اپنا قصیدہ پڑھ دیا خود جی میں خوش ہوئے دشمنوں کو ہوشیار یا بدگمان کیا اپنوں نے داد دی دوسروں نے ڈنڈا سنبھالا۔ مشاعرہ کی محفل کو دنیا کی بساط سمجھ لی وہاں سے اٹھے تو یہ سمجھا کہ سارے جہاں کو زیر و زبر کر دیا ہے۔

نیاز فتحپوری

رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر ہیں جو ایک معیاری ادبی رسالہ ہے ان کی انشاء زریں میں جمالیاتی اور رومانوی حسن پایا جاتا ہے انداز میں عربیت غالب ہے حسین ترکیبوں کے بت تراش ہیں جن میں ان کے ذوق جمالیات کی رنگ آمیزی ہوتی ہے مطالعہ وسیع ہے ہر مسئلہ پر آزادئ خیال سے سیر حاصل بحث کرتے ہیں تخلیقی اور تنقیدی دونوں قسم کے مضامین ان کے قلم سے نکل چکے ہیں افسانوں میں رومانیت پائی جاتی ہے ان کی زرنگار انشا کا اندازہ ذیل کے ایک مضمون "ایک مصور فرشتہ" سے ہو سکتا ہے

ایک مصوّر فرشتہ

اب سے بہت پہلے، کروڑوں برس پہلے، جب تکوین عالم کا بالکل آغاز تھا آفرینش یا تو امواج آب سے ملتفت تھی یا وادی قاف کی نسرین و نسترن زار میں کچھ خشکی کا حصہ سارے عالم میں بس اسی قدر تھا اور زیر آب حباب کا حکم سوا اس قطعہ زمین کے ساری کائنات کو محیط۔ لیکن حالت یہ تھی کہ سبزہ نہ تھا مگر یاسمین، اور چھوٹی سی چھوٹی موج آب نہ تھی مگر برگ نیلوفر، سپید اور صرف سپید رنگ میں تمام موجودات عالم ملفوف تھے، گویا یہ بحر ہنس رہا تھا۔

آفتاب صرف چند لمحات کے لئے اپنے فرائض انجام دینے کے لئے نمودار ہوتا اور غائب ہو جاتا۔ صرف ایک چاند جو غمزہ و محاق سے ناآشنا تھا اس تبسم آباد کا دیکھنے والا تھا، کیونکہ نباتات ہوں یا دیگر مخلوقات، نزاکت تخلیق کی وجہ سے تمازت آفتاب کی برداشت نہ کر سکتے تھے، اور اس لئے جب آفتاب کی پہلی شعاع نمودار ہوتی تو فضائے عالم پر ایک سکون مطلق طاری ہو جاتا اور یہ بحر خواب میں بیہوش۔

ایک شب کا واقعہ ہے۔ وادی قاف میں سپید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا۔ فرط تعطر سے پنکھڑیاں جا بجا شق ہو گئی تھیں۔ چاند اپنی چادر سیمیں پھیلا کر اس میں اتر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیاء ماہ بس کر رہ گئی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریں ہیں اور یہ گھونگرو کے دانے جو صبا کے نرم و نازک پاؤں سے فرش آب پر ہنگام رقص نکل کر رہ گئے ہیں ۔۔۔ کرۂ آب یا دشت نیلوفر میں جو کلی کہیں کچھ کھل کر

رہ گئی تھی، اور اس کے اندر قطرہ آب جگمگا رہا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ناہید فلک کا ہیکل کسی شوالہ میں رکھا ہوا ہے۔

چاند نصف فلک طے کر چکا تھا کہ سطح آب کی حرکت یکایک بند ہو گئی جو موج جہاں تھی وہیں سہم کر رہ گئی، نیلوفر کی کلیاں آہستہ آہستہ ساحل کی جانب ایک قطار میں آکر قائم ہو گئیں، ہوا بند ہو گئی، اور ایک ایسا سکون پیدا ہو گیا جیسے یہ مختصر سی دنیا چلتے چلتے اکبارگی حیرت سے ٹھٹک کر رہ گئی۔

دفعتہً ساحل پر پھیلی ہوئی چاندنی پھٹی اور جیسے کوئی چادر کا کونہ پکڑ کر جھٹکا دے بالکل اسی طرح سطح آب میں تموج پیدا ہوا ۔۔۔ ہوا چلنے لگی، اور نیلوفر کی ساری کلیاں دفعتہً کھل پڑیں۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں منھ میں ایک ایک صدف دبائے سامنے آگئیں اور ہنس ایک ایک دانۂ مرجاں اپنی چونچ میں لئے ہوئے باہر نکل آئے۔

ساحل پر ایک فرشتہ خاموش کھڑا ہے اس منظر کو بنگاہ غور سمجھنے کی کوشش میں مستغرق ہے وہ دفعتہً چاند کو دیکھتا ہے۔ اور دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد اپنی نظر کو آہستہ آہستہ اس طرح وادی تک لے آتا ہے گویا چاند کی شعاعوں کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی پھولوں میں آکر بس گئی ہیں۔

اس نے پروں کی شکنیں دور کیں، بازو پھیلائے، اور ایک ہاتھ میں زمردی قلم اور دوسرے ہاتھ میں ورق زر لے کر ساحل پر بیٹھ گیا ۔۔۔ وہ کچھ متفکر تھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اور اس ورق زر پر کچھ لکھنا چاہتا تھا کہ دفعتہً چونک پڑا، اور وادی کی طرف منھ کر کے اس نے ہاتھ بڑھایا ۔۔۔ خوشبو کی موجیں جو اٹھ رہی تھیں انھوں نے سمٹنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ سمٹتے سمٹتے یکجا ہو گئیں، اور انھوں نے ایک سپید شفاف جسم اختیار کر لیا ۔۔۔ فرشتے نے

اس جسم کو اپنی مٹھی میں لے کر ایسا فشار دیا کہ وہ بے شمار منور ذروں میں چور چور ہو گیا، اور ایک جگہ زمین پر ڈھیر۔

فرشتہ کچھ مطمئن سا نظر آتا تھا، اس نے اب مچھلیوں کی طرف غور سے دیکھا اور بہ یک اشارۂ انگشت جتنی سیپیاں تھیں کھل کر رہ گئیں، اور موتیوں کے شفاف و پاکیزہ دانے نظر آنے لگے۔ اس نے قلم لے کر اسی ورق زر پر کچھ لکھا اور پھر اک نگاہ گرم سے ان موتیوں کی طرف دیکھا۔ اب ہر صدف بجائے موتیوں کے ایک سیال شے سے لبریز تھی فرشتے نے ہر صدف سے یہ رقیق مادہ لیا اور ان ذرّوں پر چھڑک دیا۔

فرشتہ اٹھا اور ان ذرّوں کو اس پانی میں گوندھنے لگا، لیکن اسی کے ساتھ وہ نیلوفر کی نرم و نازک پتیوں کو بھی دیکھتا جاتا تھا، اور ان دانہائے مرجاں کو بھی جو ہنس لئے کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پنکھڑیاں سمٹ دبگیں ہو گئیں اور مرجاں سپید یعنی اس نے ان پتیوں کا لوچ لے لیا اور دانوں کا رنگ اور انھیں ذروں میں انھیں ملا بھی دیا۔

ہنس چلے گئے، مچھلیاں غوطہ لگا کر غائب ہو گئیں، اور نیلوفر کی کلیاں سطح آب میں غرق ــــ ادھر وادی قاف خالی پڑی تھی، اور ادھر ورق آب سادہ۔

کامل ۱۵-۱۶ گھنٹوں کے بعد اس خاک میں تفنج پیدا ہوا اور فرشتہ اپنی انگلی کے اشارہ سے اپنے اور اس خمیر کے گرد ایک حصار کھینچ کر نگاہوں سے غائب ہو گیا

ایک دن، دو دن۔ مہینہ، دو مہینہ، سال، دو سال، یہاں تک کہ برسوں ہو گئے اور وہ صانع فرشتہ اسی پردہ حصار میں غائب رہا۔

ایک شب وہی ساعت تھی اور وہی رات چاندکی وہی درخشانی تھی اور پانی کی وہی روانی کہ یکایک وہ سنگین حصار پگھل کر بہہ گیا اور فرشتہ خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ اس نے عدن میں سنا تھا کہ جب پتھر پانی ہو جائے گا، اسوقت

اس کام کی تکمیل کا وقت آئے گا۔

ایک حسین و جمیل کالبد بےحس و حرکت پڑا ہوا تھا فرش خاک کا ہر ہر ذرہ، سطح آب کا ہر ہر قطرہ چاند کی ہر ہر کرن اس کالبد بےجان کی طرف کھنچی چلی آتی تھی اور فرشتہ اپنے بازوؤں کی ہوا، ہاتھ کی حرکت سے انھیں ہٹاتا جاتا تھا۔۔۔ تاہم وہ کچھ متشوش تھا اس کی نظریں اس کالبد میں کچھ کمی محسوس کر رہی تھیں۔ وہ ہر ہر چیز پر ایک غائر نگاہ ڈال کر کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔

اس تعطر و نور رنگ اور لوچ سے خمیر کی ہوئی صورت میں ایک ایسی شفاف یکسانیت تھی جس کو وہ دور کرنا چاہتا تھا۔ تمام اعضا بن چکے تھے لیکن وہ اس نورانی مجسمہ میں کوئی بات ایسی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جو اس کی رنگین سپیدی کی رونق کو اور بڑھا دے وہ خاموش چاند کو دیکھ رہا تھا کہ اس نے چاندنی کی طرف ہاتھ کے جھٹکے سے ایسا اشارہ کیا کہ وہ ہر جگہ سے مسک کر تار تار ہو گئی تمام فضا میں باریک باریک شعاعیں بکھر کر رہ گئیں۔

فرشتہ اس منظر سے دیر تک متاثر رہا اور پھر اس نے اپنی انگلیاں ان شعاعوں کی طرف بڑھا کر آہستہ آہستہ مٹھی بند کرنا شروع کی، یہاں تک کہ جس وقت اس کی ہتھیلی سے اسکی انگلیاں مل گئیں تو تمام عالم میں اندھیرا سا تھا روشنی اس نے مٹھی میں کھینچ کر بند کر لی تھی اور شعاعیں سیاہ چمکدار ریشم کے لچھوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

فرشتہ نے فوراً وہ ساری چمک جو اس کی مٹھی میں بند تھی اس کالبد کی آنکھوں میں منتقل کر دی اور ان ریشمی کرنوں کو خم دیکر شانہ و دوش پر چھوڑ دیا، ٹھیک اسی وقت دفعتہ ایک گرج پیدا ہوئی آسمان پھٹ گیا۔ پانی خشک ہو گیا اور زمین بخار بن کر غائب ۔۔ اب فرشتہ بیہوش تھا اور وہ کالبد عدن میں جلوہ گر۔

ملائکہ سر جھکائے کھڑے تھے حوریں اس کا حلقہ کئے ہوئے تھیں اور عدن کا ہر

طاری چھپا رہا تھا۔

مگر اے عورت تو فرشتوں اور حوروں کی نگاہ میں خواہ کچھ ہو لیکن یہ ہمیں جانتے ہیں کہ تیرے خمیر میں کتنی خوشبوئیں کتنی رنگینیاں کتنی نزاکتیں شامل ہیں تجھے خبر نہیں مگر ہمیں معلوم ہے کہ تیرے تبسم میں کیوں ایک پرگہر صدف کے کھلنے کا انداز پایا جاتا ہے تجھے اس وقت ہوش نہ تھا مگر ہم دیکھ رہے تھے جب تیری انگھڑیوں میں سارے جہاں کی چمک منتقل کی جا رہی تھی۔

تیری عصمت میں ایک صامتیت ہے کیوں؟" اس فرشتہ سے پوچھ جس نے کامل پندرہ سال تک بے آب و دانہ رہ کر تیری تعمیر کی۔ تجھ میں حیا ہے، تو اپنے جسم کو سمیٹ کر ہم سے الگ ہو جانے پر مجبور ہو جاتی ہے، کیوں؟ یہ اس خلوت کا نتیجہ ہے جو برسوں ایک حصار رنگین کے اندر تجھے لئے رہی۔

ہم کیوں تیری ایک ایک شب کیلئے سارا مایۂ حیات دیدینے پر راضی ہو جاتے ہیں محض اس لئے کہ تو رات ہی کو پیدا ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ رات بے کیف و بے روح ہے جس میں تو نہ جگمگا رہی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم

علیگڈھ یونیورسٹی کے مایۂ ناز فرزند اور افسانہ نما مضامین کے بانی تھے جو نہ صرف انگریزی ادب سے بہرہ ور تھے بلکہ ترکی ادب سے بھی واقفیت اور دلچسپی تھی۔ یلدرم نے ان سب باغوں سے پھول چنے انکا انداز تحریر رومانی ہے اور اس میں ایک قسم کا تیکھا پن پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں جذبات کو معتدل کرنے کی کوشش ملتی ہے ان میں ایک طرح کی جھجک اور ہچکچاہٹ پائی جاتی ہے۔ سجاد حیدر تشبیہیں اور استعارے بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کرتے ہیں طبقہ اعلیٰ کی خواتین کی واردات قلبی کی اچھی طرح عکاسی کرتے ہیں زبان میں شعریت ملی ہوئی ہے۔ ذیل میں انکا ایک مضمون "داماد کا انتخاب" دیا جاتا ہے جو ملائیت، اور فرنگیت کا ایک تصادم ہے سجاد حیدر کے مضامین کے دو مجموعے "خیالستان، اور حکایات واحتساسات" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں

داماد کا انتخاب

شیخ امراللہ کا سارا وقت عبادت اور اوراد و وظائف میں گزرتا تھا دوستوں عزیزوں کے بچے بڑھ کر جوان ہو گئے انھوں نے نہ کبھی ان کی شکل دیکھی اور نہ انھیں پہچانا گھر کے انتظام سے وہ بے خبر آنے جانے والوں سے وہ لاعلم لیکن شیخ صاحب ایک ہفتہ سے بہت ششش و پنج میں تھے ان کی پیاری بیٹی جمیلہ کے دو طالب پیدا ہوئے تھے اور دونوں اتفاق سے ڈاکٹر دونوں کے پیام لانے والے شیخ امراللہ کے راستہ کا چھ سات دن سے تانا بانا کر رہے تھے۔ خوشامدیں کر کر کے ان سے وعدہ لینا چاہتے تھے ایک کہتا تھا "لڑکا آپ کی جمیلہ کا دل و جان سے طالب ہے" دوسرا کہتا تھا "لڑکے کے منہ میں ہفتہ بھر سے کھیل اڑ کر نہیں گئی ہے کہتا ہے اگر جمیلہ نہ ملی تو نہ کھاؤں گا نہ پیوں گا خودکشی کر لوں گا۔" شیخ امراللہ کیلئے دونوں مجہول تھے دونوں اگرچہ ان کے عزیز تھے لیکن ان کے عادات و اطوار سے واقف ہونا تو علیحدہ رہا انھوں نے ابھی تک کسی کی صورت تک نہیں دیکھی تھی حیران تھے کیسے انتخاب کریں۔ کسے اپنی بیٹی دیں۔ خال اور استخارے دیکھتے سب سے زیادہ فکر انھیں ان کے عادات و اخلاق کے متعلق تھی۔ ان کی بیٹی کے طالب، کیا طبیعت کیسے خیالات رکھتے تھے؟ اگر ان کا اعتقاد سست اور مزاج غیر متین ہوا تو ان سے گزارا مشکل ہو گا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کا داماد ایک قوی ایمان کا مالک ہو۔ پابند صوم و صلوٰۃ واقف اصول و فروع دین ہو فقرا و ضعفا کا بہت خیال کرتا ہو۔ نرم دل ہو۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں کہ وہ امور دین سے واقف اور ان پر عامل ہے تو کم سے کم دو شاہد عادل سے تو سن چکے ہوں اس کی تحقیق بغیر تو وہ اپنی

چہیتی بیٹی کو دینے سے رہے کیا وہ اپنے لخت جگر کو اپنے گھر سے دھکا دے کر گلی میں پھینک دیں گے۔

مگر اس کی تحقیق کس طرح کریں۔ دونوں لڑکوں میں سے کسی سے واقف نہیں تلاش پر بھی کوئی ایسا قابل اعتماد آدمی نہ ملا جو ان کے صحیح صحیح حالات بتا سکے برخلاف اسکے ان کے کانوں میں تو یہ خبریں پہنچی تھیں کہ ان میں سے ایک تو ایسا ہے جس نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی خدا کو سجدہ نہیں کیا بلکہ وہ ایک فرنگ مآب فلسفی ہے۔

آخر ایک دن شیخ امر اللہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ایک مہینہ سے انکے گھر میں خدا کی بھیجی ہوئی ایک مہمان بڑھیا ٹھہری ہوئی تھی یہ ایک بے یار و مددگار ضعیفہ تھی جو نہ معلوم کہاں سے گھسٹتی گھسٹتی ان کے دروازے تک آئی تھی اور انھوں نے اپنے ہاں اسے ٹھہرالیا تھا مگر بیچاری بڑھیا جس دن سے آئی اس دن سے بیمار جو پڑی تو آج تک بیمار تھی۔ بخار میں پھنک رہی تھی اور اب اس میں بستر سے اٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی سب گھر والے پریشان و متفکر تھے ہر روز اس کے منھ میں غذا و دوا چواتے تھے اور بستر پاک کرتے تھے اس بیمار کو اک طبیب حاذق کی ضرورت تھی شیخ امر اللہ ایسے خسیس و سنگدل نہ تھے کہ اس ضعیفہ کے علاج میں جس نے ان کی چھت کے نیچے آکر پناہ لی تھی ہر ممکن کوشش و صرف سے دریغ کرتے لیکن یہ موقع بھی اچھا موقع تھا ان کی جوان لڑکی کے طالب دو ڈاکٹر تھے انھیں ہی بلانا چاہئے ان سے باتیں کرنی چاہئیں ان کے خیالات و افکار کی تحقیق کرنی چاہئے اور اس میں سے جو بہتر معلوم ہو جمیلہ کو اسے سونپنا چاہئے اس تجویز کا انھوں نے اپنی بیوی کے سوا اور کسی سے ذکر نہیں کیا۔ بیوی نے جب انکی رائے سے اس طرح اتفاق کیا گویا وہ ان میں سے کسی سے بالکل واقف نہیں تو انھوں نے دونوں کو فوراً خط لکھے جن میں دو دو دن کے فاصلہ سے ان سے ملاقات کرنے کیلئے

وقت مقرر کئے خط ڈاک میں ڈال دیئے گئے۔

۳ر جولائی صبح

آج صبح چھٹی رساں مجھے دو خط دے گیا۔ میں نے دونوں کو کھولا اور پڑھا اللہ میں کیسا خوش قسمت ہوں ایک پر پیاری جمیلہ کے اور دوسرے پر اس کے باپ کے دستخط تھے۔

شیخ امر اللہ کے خط کا مطلب یہ ہے :۔

ان کے گھر میں کوئی یکایک بیمار ہوگیا ہے جب کہ میں ان کا فرزند بننے کیلئے تیار ہوں تو انھیں مناسب نہیں معلوم ہوا کہ مجھے چھوڑ کے وہ کسی اور ڈاکٹر کو بلائیں لہذا مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ ازراہ سعادت مندی میں دوشنبہ ۵ ر جولائی کو تکلیف کرکے ان کے گھر آؤں۔

حالانکہ جمیلہ کا پیارا خط کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔ میرے سامنے جو تم مذہب کے متعلق واہی تباہی بکا کرتے ہو خبردار ابا جان کے سامنے وہ فضول بکواس مت کرنا تم جانتے ہو ابا جان مذہب کے معاملہ میں اٹل اعتقاد رکھنے والے ہیں۔ جس بیماری کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ معمولی بیماری ہے اس کی مصیبت تو ہم ایک مہینہ سے جھیل رہے ہیں یہ تو ایک بہانہ ہے کہ تمھیں دیکھ کے تم سے جرح کرکے تمھارے متعلق رائے قائم کی جائے کہ تمھیں دامادی میں لیں یا نہ لیں۔ تمھارے رقیب کا میں نے تم سے اسدن ذکر کیا تھا۔ ابا جان کا اس کے نام بھی خط گیا ہے وہ بھی آئے گا مگر اس آدمی کو جسنے اپنی سی سالہ زندگی سختی میں اور اپنی جوانی تمھاری طرح پیرس ولندن جیسے دیار عشرت میں نہیں بلکہ یہاں ریاضت و عبادت میں گزاری ہے ، جانتے ہو میں نے کیا خبر بھجوائی ہے ابا جان کے سامنے خوب تیار ہو کے آئیں۔ ابا جان اگرچہ مولوی ہیں مگر

مغربیت ونئی روشنی کی بڑی قدر کرتے ہیں ان سے باتیں کریں تو ٹھونس ٹھونس کے جا و بیجا انگریزی فقروں اور لفظوں کا استعمال کریں اگر مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسکا صرف ایک ذریعہ ہے کہ اس ملاقات میں حتی الامکان فیشن ایبل اور آزاد خیال بنیں۔

وفاشعار مہربان ونوازش کار جمیلہ کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں اس خط کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ میری اور اس کی خوب گزرے گی۔

آج بازار جاکر، اک ریشمی ڈورے اور ریشمی پھندنے کی نہایت خوبصورت تسبیح خرید کر لاؤں گا۔

۵ رجولائی شام

میں شیخ امراللہ سے ملاقات کر کے ابھی آیا ہوں اپنے پیارے قابل عزت خسر سے مجھے شرف نیاز حاصل ہوا بڑی دیر تک لطف وعنایت فرمائی۔ ہنس مکھ چہرے سے میرا استقبال کیا مریضہ کے کمرہ میں مجھے خود لے گئے۔

مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد ہم دونوں کمرہ سے باہر آئے تو مجھ میں اور شیخ صاحب میں یہ گفتگو ہوئی عزیز من۔ کہو مریضہ کی کیا کیفیت ہے"

"شکر ہے خدا کا شکر"

"بالکل ناامیدی تو نہیں کیوں ؟"

"(سر جھکا کر) اللہ بہتر جانتا ہے انسان کچھ نہیں کہہ سکتا"۔

"تو کیا وہ مسافر دار آخرت ہے۔ آپ کا یہ مطلب ہے"!

"لا واللہ۔ مع ذلک المقدر لا یغیر۔

"قطعی یاس تو نہیں"!

"انشاء اللہ الرحمن"

شیخ صاحب نے اور بہت سے سوالات مجھ سے کئے یعنی جمیلہ نے جیسا لکھا تھا
انھوں نے طرح طرح سے تحقیقات کی ایک گھنٹے سے زیادہ زیر جرح رہا اسکے بعد
میں نے نسخہ لکھا اور دوا کے متعلق ہدایتیں کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا دن جو شیخ صاحب کی خدمت میں گزرا وہ میری
زندگی کے خوش ترین دبہ نشہ ترین دنوں میں سے تھا میرے خسر بلا شک وشبہ
بالکل لڈو پیڑا ہیں۔

۸ر جولائی

میں کل پھر مریضہ کو دیکھنے گیا تھا۔ بچاری بڑھیا کچھ ہوش میں تھی باتیں بھی
کرتی تھی کچھ مسکرائی بھی۔

شیخ امر اللہ کی باچھیں خوشی سے کھلی جاتی تھیں مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔

"عزیز من۔ عزیز من محض تمھاری کوشش سے اس کی حالت سنبھلی۔"

میں نے بطور رد کے جواب دیا۔

آپ کیا فرما رہے ہیں توبہ کیجئے توبہ کیجئے۔ ھٰذا من فضل ربی لطف الٰہی
لطف ربانی۔"

شیخ صاحب نے میرے معروضہ کی تصدیق فرمائی مسکرائے اور نظر سامنے کو گاڑ دی
واپسی میں جمیلہ سے میری باتیں ہوئی صاف دل اور بھولے رقیب کو جو دو دن قبل ذلت
نصیب ہوئی جمیلہ نے اسکا حال سنایا اس کے عجیب اطوار اس کی لایعنی انگریزی سے
گڈمڈ گفتار نے شیخ صاحب کو اس قدر مغلوب غضب کر دیا تھا کہ انھوں نے اسے
اپنے سامنے سے نکال دیا تھا

۱۲ر جولائی شب

آج رات میں دیر سے گھر لوٹا تو جمیلہ کا ایک خط مجھے ملا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے

دل سے اسے کھولا اور پڑھا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا میں نے خط کو دوبارہ پڑھا تو یہ صحیح تھا کہ جمیلہ اب میری تھی ! شیخ امر اللہ نے اسکا فیصلہ کر لیا تھا اور بیوی کو بھی اطلاع دے دی تھی ۔

پیاری جمیلہ کا خط جو ایسی بڑی بشارت میرے لئے لایا میری کامیابی کے راز کو اس طرح بیان کر رہا ہے۔ میں اپنے منھ پر ہاتھ رکھے کہ کہیں آواز نہ نکل جائے کواڑ کی دراز میں کان لگائے سن رہی تھی ابا جان بڑی بی سے تمھارے متعلق یہ کہہ رہے تھے "حاذق ڈاکٹر ہے اور پھر الحمد للہ پکا سچا مسلمان ۔ وہ دوسرا تو بے دین ملحد ہے اور یہ اسکی طرح دو ٹوک بات نہیں کہتا امید ہے بڑی بی جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔

پطرس بخاری

اردو کے مشہور ظرافت نگار تھے جن کے مضامین کا صرف ایک مجموعہ "پطرس کے مضامین" کے نام سے شائع ہوا اور مقبول ہوا۔ بعد کو سرکاری ملازمتوں کی مصروفیت کی بنا پر ادبی دنیا کے نزدیک وہ مرحوم ہو گئے اور شائقین ان کی ظرافت کاری کے مطالعہ سے محروم رہ گئے نہایت معتدل قسم کی ظرافت پائی جاتی ہے متانت و ظرافت میں توازن رکھنے کا ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ ظرافت نگاری ایک مشکل فن ہے ذراسی لغزش سے ظرافت رکاکت اور ابتذال تک پہنچ جاتی ہے یا اس کی غیر معمولی زیادتی انسانی نفسیات سے متصادم ہو کر طبیعت کو اکتا دیتی ہے۔ پطرس کے مضامین میں سے "کتے" کے عنوان سے ایک مضمون نقل کیا جاتا ہے جو بہت دل چسپ ہے۔

کتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتّے کیا کرتے ہیں کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے کتّے نے ایک مطلع عرض کر دیا اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتّے نے زوروں کی داد دی اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے کمبخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ کر لائے تھے کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتّے بھی کچھ عجیب بد تمیز واقع ہوئے ہیں اکثر تو ایسے

ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلوں کوٹ دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے اس کا ذکر ہی جانے دیجئے اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدہ ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی بخ کردی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہوگیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر بخ کردی۔ چوکی داری کی چوکی داری۔ موسیقی کی موسیقی ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر تان پر تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لیجئے کہ ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو شاید آپ اس کو تعلی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہئے کہ دافع بلیات ہے لیکن ہم خواہ مخواہ کسی سے عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ اگر ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگائیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے کہ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبعیت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی

اس کی جگہ شاید آپ دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آرہے ہیں چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور خوشفعلی کا عالم بھی ہے اسلئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے سامنے ایک بکری بندھی تھی ذرا تصور ملاحظہ ہو آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا یہ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمے ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویئے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہوگئی لیکن کیا مجال ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا تاریخی مصرعہ دعا یہ ہوتا کہ

"اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو"

لیکن ؎ کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھر کم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبہ کو قائم رکھنے کے

بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک " اگرچہ ایسے وقت میں اسکو زنجیر سے بندھا ہونا چاہئے ۔ لیکن یہ کمبخت دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے ۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں ۔ لیکن ہر کوئی ان کی جاں بخشی تھوڑا ہی کر دیگا ۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے ۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے انکا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہئے کہ ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں ! ہر ایک طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے کچھ انکا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی سکنات ہماری) اس ہنگامہ میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے ۔ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجہ کی نا انصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے اگر ان کا ایک نمائندہ ، شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہدے کہ عالی جناب سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کئے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ اور متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا کمینہ حرکت ہے ۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرہ میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے مجھے کسی کی دل شکنی منظور نہیں ۔

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں کتے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں
آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات
ظاہر ہوتے ہیں جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ
نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے سڑک کے بیچوں بیچ میں
غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں
کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا
گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا خود دس بارہ دفعہ آوازیں
دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت
حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔
تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے اور خیالات
کے سلسلہ کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے
نے گھنٹی بجائی تو لیٹے ہی لیٹے سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے
راستہ چھوڑ دینا وہ فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں رات کے وقت یہی کتا اپنی
خشک پتلی سی دم کو بحدِّ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے
برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں
رکھ دیا۔ انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی "بچہ
فقیروں کو چھیڑتا ہے نظر نہیں آتا ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں"۔ بس اس فقیر کی
بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب
نظر آتے رہتے ہیں۔ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے
آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوائن میں پھنسے ہوتے ہیں۔
اگر خدا مجھے کچھ عرصہ کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے

تو جنون انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کیلئے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعث ننگ ہے انگریزی میں ایک مثل ہے کہ بھونکتے ہوئے کاٹا نہیں کرتے بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔
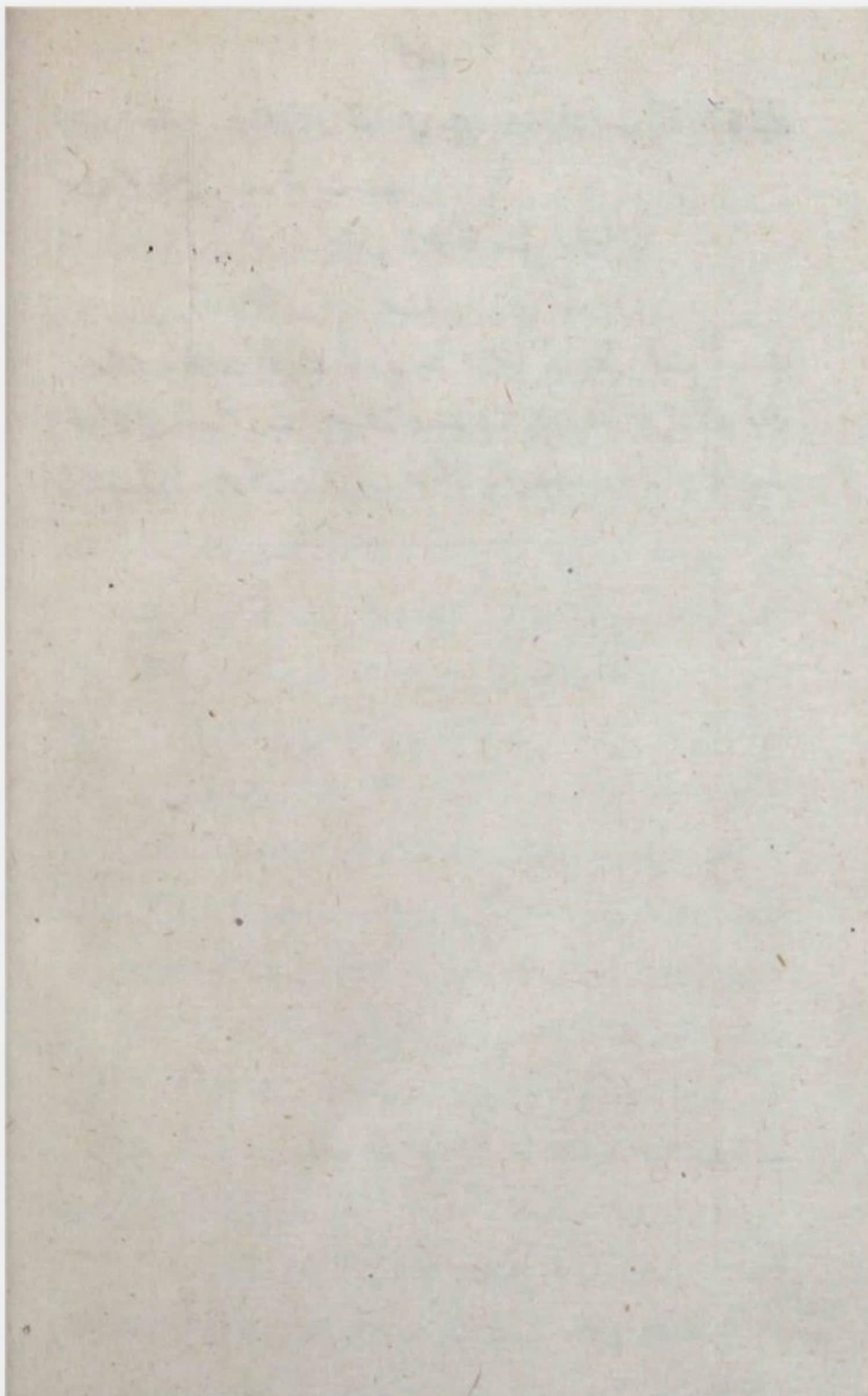
شوکت تھانوی

اردو کے مشہور مزاحیہ نگار ہیں جن کے مضامین میں ظرافت اور کہیں کہیں ہلکا ہلکا طنز بھی ملتا ہے آپ کے مضامین کے مجموعے موج تبسم بحرِ تبسم سیلاب تبسم طوفان تبسم دنیائے تبسم کے نام سے شائع اور مقبول ہو چکے ہیں۔ شوکت تھانوی بقول رشید احمد صدیقی گھریلو ظرافت کے بڑے دلدادہ ہیں اور اس کے ماہر بھی۔ شوکت کی زبان و بیان دونوں اچھے ہیں ذیل میں ان کا ایک مضمون "تکیہ کا غلاف" دیا جاتا ہے جس سے ان کے اندازِ نگارش کا بھی پتہ چل سکتا ہے اور بعض اخلاقی کمزوریوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کہیں نفسیاتی چیزیں بھی پیش نظر رکھی ہیں۔

تکیہ کا غلاف

بھائی جان نے ہمارے بستر سے تکیہ اٹھا کر بھابی جان کے حضور میں پیش کرتے ہوئے کہا
"میں نے کہا" دیکھتی ہو کتنا خوبصورت باریک اور نفیس کام دلہن نے بنایا ہے جی چاہتا ہے کہ دیکھتی ہی رہو۔"
بیگم کی تعریف سن کر غیر ارادی طور پر ہمارے ہاتھ مونچھوں پر تاؤ دینے کیلئے اٹھ گئے اور غیر محسوس طور پر کچھ شان سی ہم میں پیدا ہو گئی معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا یہ بیوی کی تعریف نہیں ہوتی ہے بلکہ ہم تو آغا خاں ہیں اور ہمارا گھوڑا ڈربی ریس میں ون آیا ہے مگر بھابی جان کے رخ روشن پر جو نظر اٹھی تو وہاں سنہے سے لے کر ناک اور پیشانی کی کمانیاں خراب ہو چکی تھیں۔ اور جبیں بہ جبیں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو بہت سخت گالی دے دی گئی ہے۔ مگر بھائی جان تھے کہ تعریفوں کے پل باندھے دیتے تھے۔
اس تکیہ کے غلاف میں خوبی یہ ہے کہ تاج محل کا جو نقشہ پیش کیا ہے اسکی ایک ایک اینٹ ظاہر کر دی ہے اور اس کے سامنے تو نہر کے فوارے سبحان اللہ خدا نظر بد سے بچائے ماشاء اللہ خوب بنایا ہے۔
بھابی جان سے آخر نہ رہا گیا جل کر بولیں "میں کہتی ہوں کہ آخر تم کو کوئی اور کام بھی ہے بس بیٹھے ہوئے بھاوج کی تعریفوں کے پل باندھے جاؤ گے جیسے کبھی کشیدہ کاری دیکھی نہیں ہے۔"
بھائی جان آدمی ہیں سخن فہم اس جلی کٹی کو فوراً سمجھ گئے مگر چونکہ اس وقت

صاف گوئی پر تلے ہوئے تھے لہٰذا سوبی پر یعنی بیوی کے سامنے بھی بول دئے کہ "کشیدہ کاری دیکھی کیوں نہیں ہے مگر میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ کشیدہ کاری کی جو نزاکت اس نمونہ میں پیش کی گئی ہے وہ اس فن کے کمال کا درجہ رکھتی ہے"

بھابی نے اور بھی جل کر کہا "اچھا تمھاری بھاوج بڑی لائق سہی اور میں بڑی نالائق سہی" بھائی جان نے گڑبڑا کر جلدی سے کہا "کس مردود نے کہا تم نعوذ باللہ نالائق ہو بھئی بات یہ ہے کہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

میرے خیال میں تم کچھڑا ایسا پکاتی ہو کہ بڑا سے بڑا باورچی بھی تمھارے سامنے نہیں ٹھہر سکتا یا جیسے بنڈے کے کچالو تم بنا لیتی ہو میں تو کہتا ہوں بڑے سے بڑے لاٹ کی بیوی بھی ویسے کچالو نہیں بنا سکتی مگر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تکیہ کا غلاف بھی دلہن نے خوب بنایا ہے۔

بھابی جان نے منھ چڑھا کر کہا "جس کو ذرا فرصت ہو اور سوئی ہاتھ میں پکڑنا جانتی ہو وہی بنالے گی یہ تو بہت معمولی سا کام ہے"

"یہ معمولی کام ہے۔ اجی نہیں تم مذاق کرتی ہو" بھابی جان نے کہا مذاق نہیں تو کیا بی اے ایم اے کی ڈگری ہے۔ جب کہو میں تم کو خود بنا کر دے دوں مگر تم بے ڈھنگے دو دن میں تیل سے چپڑا ہوا سر رکھ کر چیکٹ کر دو گے۔"

بھائی جان نے کہا "تم بھی بیگم بخدا کمال ہی کرتی ہو ارے بھائی اور تو خیر کچھ نہیں لیکن اگر تم ایسا تکیہ کا غلاف بنا دو تو آج سے تمھارا غلام ہوا جاتا ہوں۔ تم کہتی ہو تیل سے چپڑا ہوا سر رکھنے کو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں اس کو شیشہ کے چوکھٹے میں جڑوا کر اپنے بیٹھک کے کمرے میں آویزاں کر دوں گا۔"

بھابی جان کو جو غصہ آیا تو اپنی بقچی کھول کر ہمارے تکیہ کو سامنے رکھ کر بیٹھ گئیں

فی البدیہہ تکیہ کا غلاف فرمانے۔ بھائی جان تھوڑی دیر تو چشمہ سے نظر بھینداھینداکر
اپنی بانوے محترم کی اس اداکو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے لگے اونگھنے
اور پھر رفتہ رفتہ خراٹے دار نیند نے ان کو غائب کر دیا۔ ہم خاموشی کے ساتھ
اخبار پڑھنے لگے۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ ہم عرصہ کے بعد دسہرے کی تعطیل میں بھائی جان سے
ملنے آئے تھے اور بغیر کسی تخصیص کے بیگم نے تکیہ پہ زیر بحث غلاف بھی چڑھا دیا تھا
اگر اس غریب کو یہ معلوم بھی ہوتا کہ یہی غلاف باعث "موازنہ انیس و دبیر" بن جائیگا
تو قیامت تک بھابی جان سے تصادم کے لئے تیار نہ ہوتی مگر یہاں تو اس تکیہ کے
غلاف نے اچھا خاصا محاذ جنگ قائم کر دیا تھا۔ اور ہم بھابی جان کی افتاد طبیعت
کی روشنی پہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا ہی خیر کرے بھائیجان
کے بے تکے پن سے ہم واقف تھے کہ وہ فساد کی ایک بنیاد قائم کرنے کے بعد اس
فساد کے نتیجہ پہ پہنچکر ہمیشہ پچھتائے ہیں کہ یہ میں نے کیا کیا اور وہی رنگ اس
تکیہ کے غلاف کے سلسلہ میں بھی ہم دیکھ رہے تھے لہٰذا بھائی جان تو خراٹے
لے رہے تھے اور ہم اخبار پڑھنے کے بہانے اس وظیفہ کو پڑھ رہے تھے کہ "جل تو
جلال تو صاحب کمال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو" خدا جانے اسی عالم میں ہماری بھی
آنکھ کب لگ گئی حالانکہ ہم دن میں سونے کے عادی نہیں ہیں بہر حال جب آنکھ
کھلی تو چراغ جلنے کا وقت تھا مگر بھائی جان بدستور دالشرائے کا اسپشل بنے
خراٹوں سے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ سو رہے تھے اور بھابی جان کی تمام تر
توجہ اسی تکیہ کے غلاف کی جانب مبذول تھی۔

ہم نے جلدی سے اٹھ کر بھائی جان کو اٹھایا اس لئے کہ اس وقت ایک
عصرانہ میں شرکت کرنا تھی ان حضرت نے اٹھتے ہی پہلے تو اپنی رفیقہ حیات

کے اس انہماک کو بڑے پیار اور ماستا کی نظروں سے دیکھا پھر خدا جانے کیا خیال
آیا کہ ان کی کاریگری کو دیکھنے کے لیئے ان کی طرف جھپٹے مگر بھابی جان نے فوراً
اپنے بنائے ہوئے غلاف کو زانو کے نیچے دبا کر کہا " یہ کیا میں ابھی نہ دکھاؤنگی
جب بالکل تیار ہو جائے گا اس وقت دیکھئے گا" بھائی جان ہمیشہ کے جلد باز
واقع ہوئے ہیں کہنے لگے " تاہم بطور نمونہ آخر کیا مضائقہ ہے۔"
بھابی جان نے کہا " اوہو نہ" میں ہرگز اس کی جھلک بھی نہ دکھاؤں گی
آخر جلدی ہی کیا ہے" ادھو بھابی جان نے یہ انکار کیا اور ادھر ہم نے بھائی جان
سے ٹی پارٹی میں چلنے کی جلدی کی لہذا وہ بیچارے کچھ مجبور ہو گئے اور ہمارے
ساتھ ٹی پارٹی میں شرکت کے لیئے روانہ ہو گئے ٹی پارٹی سے ہم لوگوں کی واپسی
تو جلدی ہی ہو گئی تھی مگر راستہ میں ایک بہت عمدہ فلم کا اشتہار دیکھ کر سنیما کا
پروگرام بن گیا اور وہاں سے رات گئے واپسی ہوئی دیکھتے کیا ہیں بھابی جان
بدستور لیمپ کے سامنے بیٹھی ہوئی آنکھیں پھوڑ رہی ہیں بھائی جان اسوقت بھی
غلاف دیکھنے پر اصرار تو ضرور کرتے مگر بھوک کے غلبہ کے آگے ان کے لئے دنیا
ہیچ ہوتی ہے چنانچہ آتے ہی دو زانو تخت پر بیٹھ گئے اور پیٹ سہلا کر بڑی زور
سے " کھانا لاؤ" کا نعرہ بلند کیا۔ بھابی جان نے نہایت رازداری کے ساتھ
تکیہ کے غلاف کو چھپا کر جواب دیا آج تو خدا ہی ہے جو کوئی ڈھنگ کی چیز
آپ کو کھلانے کے لیئے مل جائے۔
یہ کہہ کر بھابی جان باورچی خانہ تشریف لے گئیں اور وہاں سے تھوڑی ہی
دیر میں کھانا بھیج دیا مگر اب یہ لطیفہ ہوا کہ بھائی جان نے پہلا ہی لقمہ جو منھ میں
لیا ہے تو معلوم ہوا کہ کسی نے آتش بازی کے قلعہ میں دیا سلائی لگائی منھ پیٹتے
ہوئے ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور چہرہ سرخ بہ مشکل تمام یہ غلط فہمی دور ہو سکی

کہ بھونے نہیں کاٹا ہے بلکہ سالن دراصل مرچوں کا ہریرہ ہے واقعی اس میں اسقدر مرچیں تھیں کہ خود ہم کو بھی اپنے اوپر آتش فشاں پہاڑ ہونے کا شبہ ہونے لگا آخرکار سالن سے صبر کر کے کباب جو کھاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ زندہ بکری کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں اور یکایک ہم کو اس جہالت کی طرف پھینک دیا گیا ہے جس میں آدم خوری آؤٹ آف فیشن نہ تھی کبابوں سے بھی توبہ کی اور دال پر قناعت کر کے منھ جو چلایا تو معلوم ہوا کہ سانبھر جھیل میں غوطے لگا رہے ہیں یا یہ عبور دریائے شور کی سزا بھگت رہے ہیں خیر ہم تو خاموشی سے یہ مختلف مزے ہی چکھ رہے تھے مگر بھائی جان کا برا حال تھا۔ کبھی ہیٹھک لگاتے تھے اور کبھی ڈنڑ پیلنا شروع کر دیتے تھے۔ آخر نہایت ہی جز بز ہو کر کہنے لگے۔

میں کہتا ہوں" کہ" بیگم یہ آفت کیا ہے آج تم نے نمک تک نہ چکھا سالہ تک نہ دیکھا اب بتاؤ کہ میں کیا کھاؤں اور کیونکر اپنا دوزخ پاٹوں"

بھابی جان نے ترکی بہ ترکی کہا" اب چاہے کھانا پکوالو چاہے غلاف بنوالو میرے دو ہی تو ہاتھ ہیں کوئی دس پانچ تو ہیں نہیں۔ کہ یہ بھی کروں اور وہ بھی"

بات بھی معقول اور واسطہ تھا تکیہ کے غلاف کا۔ لہذا بھائی جان نے نہایت مجبوری کے درجہ پر پہنچکر بالائی اور کباب منگوانے کی تجویز پیش کی۔ اور اس طرح رات کو پیٹ بھر سکا مگر اس کے بعد بھی اس تکیہ کے غلاف کی زیارت نصیب نہ ہو سکی اس لئے کہ وہ مکمل نہ تھا اور ہم دونوں کو حسرت دیدار ہی میں سو جانا پڑا بھابی جان بیچاری پھر اس ناشدنی غلاف کو لے کر بیٹھ گئیں اور خدا جانے رات بھر کشیدہ کاری فرمائی یا کیا کیا کہ صبح جو ہم اٹھے تو گویا ہماری بیداری کی منتظر بیٹھی تھیں اور بھائی جان اسی انتظار میں حقہ جلائے دیتے تھے ہم کو دیکھتے ہی بھابی جان نے کہا" آئیے آپ دونوں اور دیکھئے غلاف کو جلدی میں جیسا بھی بنا ہے بنا دیا ہے"

ہم دونوں نے نہایت اشتیاق کے ساتھ غلاف کو دیکھا تو بھائی جان نے دیکھتے ہی کہا۔

"یہ الٹا ہے اسے سیدھا کرو"

بھابی جان نے کہا" اے واہ! الٹا ہے یا سیدھا ذرا غور سے دیکھو"

بھائی جان نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا" اگر یہ سیدھا ہے اور میں فرض کئے لیتا ہوں کہ یہ سیدھا ہے تو بتایئے کہ بنایا کیا ہے آپ نے۔"

بھابی جان نے کہا" نہیں پہچانا اب تک یہ تاج محل ہی تو ہے۔"

بھائی جان نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا" کدھر سے ہے یہ تاج محل ذرا سمجھاؤ تو"

بھابی جان نے کہا" بھئی اللہ اب میں سمجھاؤں کیا۔ یہ دیکھو گنبد ہے۔"

بھائی جان نے کہا" گنبد اور مینارہ سمجھ جانے کے بعد بھی میرے خیال میں تو یہ لکھنؤ کی نمائش کے مختلف پویلینوں کا ایک معجون مرکب نقشہ ہے۔"

بھابی جان نے کہا" خیر تم کو میری کوئی چیز بنائی ہوئی اچھی نہیں لگتی انکو دکھاؤ"

بھائی جان نے ہم سے کہا" لو بھائی یہ تو دیکھو کیا ہے۔" ہم نے دبی زبان سے کہا" میرے خیال میں تو یہ تاج محل سے زیادہ بیلی گارد معلوم ہوتا ہے یا اسوقت کا تاج محل ہے جب گولہ باری کے بعد اس کی صورت مسخ ہو جائیگی۔"

بھابی جان نے جلبلا کر غلاف اٹھا لیا اور پھر اس کے متعلق کوئی گفتگو نہ کی یہاں تک کہ ہم دوپہر کو گھر روانہ ہو گئے۔ مگر گھر پہنچنے کے تیسرے روز بھائی جان کے خط سے یہ معلوم ہو کر سخت تشویش ہوئی۔ کہ بھابی جان اسی تکیہ کے غلاف کے سلسلہ میں لڑ کر اپنے میکہ چلی گئی ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ بھائی جان کی صورت زندگی بھر نہ دیکھوں گی۔

———
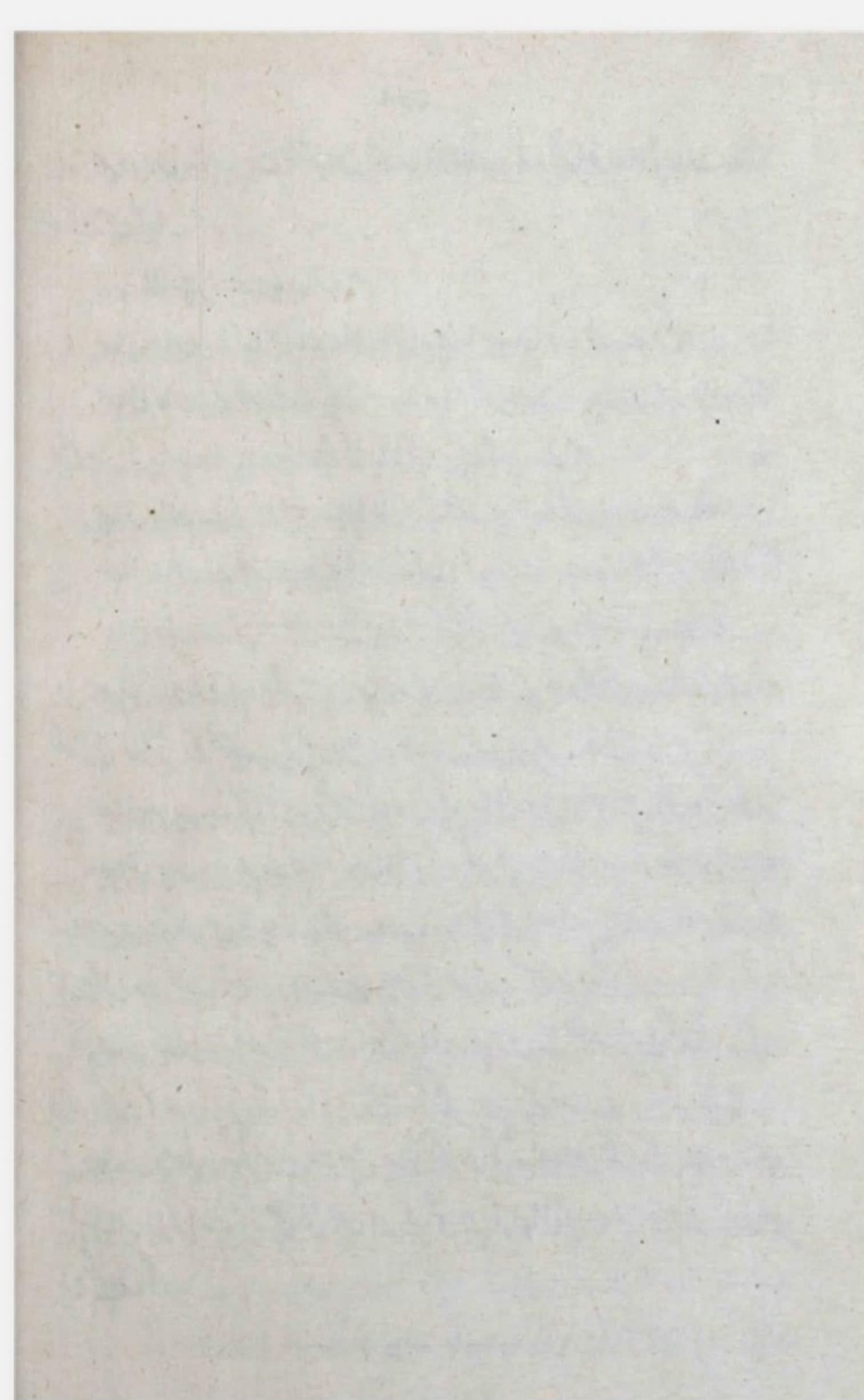
عظیم بیگ چغتائی

کردار نگاری کے سلسلہ کی ایک کڑی عظیم بیگ چغتائی ہیں آپ واقعات کا انتخاب خوب کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے افسانے ازابتدا تا انتہا نہایت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں زبان کی سلاست اور طرز بیان کی دل کشی مزید براں ہے کہیں کہیں ظرافت اپنا رنگ دکھاتی ہے۔

میں نے پڑھا ہے

میں جنت میں تھا ہاں میں بے شک جنت میں تھا اس ارضی جنت میں جس کی پرکیف گھڑیاں روح کو ابدی زندگی کا پیغام دیتی ہیں اور انسان کو دنیا میں جنت الفردوس کا نمونہ دکھاتی ہیں۔

مکتب خانہ کی پرسکون فضا میں جو مختصر لمحے گزرتے ہیں میرے لئے وہ نپولین اور سکندر اعظم کی تمنائے زندگی کی صدیوں سے زیادہ بیش بہا اور قابل قدر ہیں دائیں بائیں آگے پیچھے اور ارد گرد مجلد اور منقش خزانہ انبار در انبار چنا ہوتا ہے اس پر کتب خانہ کا سکوت نیم شبی سناٹے کو مات کرتا ہے اور میں یہی سمجھتا ہوں کہ میں الہ دین کے غار میں ہوں اور ہر چہار طرف زر و جواہر کے انبار ہیں سب میرے اور صرف میرے ذاتی تصرف کے لئے۔ بجلی کے پنکھے کی مسلسل گو عالم محویت میں ناقابل سماعت سرسراہٹ لائبریری کی فضا میں ایک خوشگوار تموج پیدا کر دیتی ہے۔ اور اکا دکا ورق ایک جمود اور خوشی کے عالم میں کپکپا کر اٹھتا ہے۔ اور نہایت ہی نازک کڑاکے کے ساتھ کان کے پردہ پر ایک خوشنما تاثر پیدا کر کے روح کو جگا دیتا ہے۔ یا پھر گھڑی کی مسلسل "ٹک ٹک" جو کمرہ کے سکوت اور اپنے تسلسل میں خود ہی جذب ہو کر ایسی ہو جاتی ہے کہ خاموشی کے طلسم کو تو نہیں توڑتی مگر ہاں اس میں آثار زندگی ضرور پیدا کر دیتی ہے۔

میں ایک دلچسپ کتاب ہاتھ میں لئے دنیا و مافیہا کے تفکرات سے بے نیاز ہو کر گویا جنت الفردوس میں تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس تاریک دنیا میں میں ایک لطیف نور ہوں یہ انہماک یہ روح پرور فضا اور یہ عالم جذب و تخیل

بس یہی معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے زندگی ایک دلچسپ اور شیریں خواب ہے کہ اتنے میں کسی نے اس زور سے میرے سر پر ایک لٹھ دیا۔۔۔۔۔ کوئی ہے ؟
کسی صاحب نے دھماکے کے ساتھ اپنا منحوس قدم دروازہ میں دھمک کر کہا "کوئی ہے" میرے سر میں برچھی سی لگی میں نے اک دم سے اپنا سر پکڑ لیا اور کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

"کوئی اخبار و خبار نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔ ہم ۔۔۔۔۔ ن ۔۔۔۔"

اتنا کہہ کر لپک کر انھوں نے میز پر اپنی انگریزی ٹوپی پٹک دی اور اس زور سے کرسی کھینچی کہ دوسری کرسی کو لوٹ دیا۔ "لاحول ولاقوۃ ۔۔۔۔۔ یہ کرسیاں" یہ کہہ کر انھوں نے کرسی کو سیدھا کیا اور پھر عجیب کھڑبڑ شروع کی لمبی چوڑی میز پر نظر دوڑا کر ایک دم سے اخباروں کو اٹھا کر پٹکنا اور پھینکنا شروع کیا اس قدر تیزی سے ورق لوٹنا شروع کیے کہ شور بے ہنگام برپا ہو گیا" کھڑبڑ کھڑبڑ" معلوم ہوری تھی ہزاروں ورق چار چار کر کے لوٹ رہے تھے اور اخبار اور رسالے گھسیٹ کر کھینچ رہے تھے کوئی دس منٹ تک ان کی یہ اخبار بینی جاری رہی۔ اتنے میں لائبریرین صاحب آگئے۔ تو یہ بولے "کوئی نیا اخبار نہیں آیا ؟"

"سب تو تازہ اخبار سامنے آپ کے چنے ہوئے ہیں" لائبریرین نے کہا فہرست بھی آج کی سامنے آویزاں ہے کہ کون کون سے اخبار موجود ہیں آپ نے دیکھی نہیں"

"اچھا" انھوں نے کہا اور فہرست جو دیوار پر آویزاں تھی اسکو غور سے کھڑے ہو کر پڑھنے لگے" اچھا تو یہ سب اخبار موجود ہیں" یہ کہتے ہوئے پھر میز پر بڑھے اور اب تصدیق کی " کیا واہیات ہے" لائبریرین صاحب کو مخاطب کر کے بولے "لائبریری کی یہ بدتمیزی نہ تھی کہ تمام اخبارات پھینٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ دیکھیے کوئی "احمق لیڈر" کے صفحے "پائنیر" میں ملا گیا۔ یہ دیکھیے پھر پرانے اخبارات

کی موجودگی میز پر کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو پریشان کرنے کیلئے"

لائبریرین نے مودبانہ عرض کی "جناب صرف ایک روز قبل کے پرانے اخبار لازمی رکھے جاتے ہیں اور وہ دوسری لائن میں ہوتے ہیں۔ مگر کیا کروں صاحب کہ کوئی بدتمیز آیا اور تمام میز کر یدکر ڈال گیا۔ ابھی ابھی تو میں قرینہ سے جمع کر گیا ہوں۔"

شاید ان حضرت کو اب پتہ چلا کہ "بدتمیز" وہ خود ہی ہیں اور سر کھجا کر انھوں نے میری طرف دیکھا کیونکہ واللہ میں گواہ تھا۔ کہ وہ بدتمیز شخص جو اس بدعت کا ذمہ دار تھا سوائے ان کے کوئی دوسرا نہ تھا۔

اخباروں پر سرسری نظر ڈال کر اور دو ایک کو جو خود انھوں نے تتر بتر کردئے تھے قرینہ سے جمع کر لائبریرین سے بولے "کوئی عمدہ کتاب نکلوا دیجیے" گویا اخبار بینی کر چکے۔

"بہت بہتر" یہ کہہ کر لائبریرین نے پوچھا "فرمائیے کون سی۔"

"کوئی اردو کی ہو" نہیں خیر انگریزی کی سہی"

لائبریرین نے انگریزی کتابوں کی فہرست سامنے کردی اور یہ حضرت کتاب پسند کرنے میں مشغول ہو گئے۔

میرے پراگندہ دماغ کو قدرے سکون ملا جب یہ حضرت لائبریرین سے کتاب لینے دوسرے کمرے میں چلے گئے میں نے کتاب دوبارہ اٹھائی۔ عبارت تلاش کی دماغ میں سلسلہ مضمون کو دوبارہ قائم کیا۔ اطمینان سے اس طرف دیکھا جدھر یہ حضرت گئے تھے کہ اب آئیں گے تو شکر ہے کہ خود کتاب پڑھنے میں مشغول ہو جائینگے نہایت ہی اطمینان سے خیالات کو ایک مرکز پر لاکر میں پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

وہ حضرت آئے اور مجھ سے کوئی پانچ چھ قدم پر ایک صوفہ پر تکیہ لگا کر میری طرف پشت کر کے بیٹھ گئے اور ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ اطمینان سے رکھ کر پڑھنے میں مشغول ہو گئے مگر حضرت یہ نہایت ہی خلیق اور ملنسار آدمی معلوم ہوتے تھے کوئی بیس سنٹ تک تو کتاب پڑھتے رہے پھر کھنکار کر زور سے میری طرف دیکھا نظر چار ہوتے ہی عجیب حیرت و استعجاب سے بولے "کمال کر دیا ہے"

میں نے ان کی بات سے کوئی دلچسپی نہ لی اور کچھ نہ بولا، تو بولے "تاج محل عجیب و غریب عمارت ہے استاد عیسیٰ نے بنایا ہے واللہ اب تک میں یہی جانتا تھا کہ نقشہ اس کا ایک اٹلی کے رہنے والے نے بنایا ہے۔

"جی ہاں" میں نے کہا اور گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے فوراً ہی اپنی کتاب پر پھر نظر جما لی۔ کیونکہ میں کتاب کے قصہ کی جس نوبت پر پہنچا تھا وہ ضرورت سے زیادہ دلچسپ تھی اور کسی کا مخل ہونا مجھے ذرہ بھر گوارا نہ تھا۔

مگر وہ کیوں چپ ہوتے بولے "مصنف نے مستند حوالہ جات سے ثابت کر دیا ہے کہ......"

"جی ہاں"، جواب پر مجبور ہو کر میں نے کہا "میں نے پڑھا ہے"۔

"یہ اول نمبر کے بدمعاش ہیں۔" وہ بولے "اول نمبر کے بدمعاش یہ یورپین مصنف......"

گھونسا تان کر انھوں نے کہا۔

میں چپ ہو کر اپنی کتاب میں پھر مشغول ہو گیا شکر ہے کہ وہ بھی مشغول ہو گئے مگر پانچ سنٹ بعد ہی وہ اچک کر بولے "یہ دیکھئے خود دوسرے مصنف مزاج مورخوں کے اقوال سے مصنف ثابت کرتا اور......"

"جی ہاں" میں نے کہا "میں نے پڑھا ہے...... پوری کتاب میں نے پڑھی ہے"

وہ پھر پڑھنے میں مشغول ہو گئے اور میں بھی مشغول ہو گیا لیکن دس منٹ کے بعد ہی پھر وہ پڑھتے پڑھتے "کیا کہنا ہے مصنف کی قابلیت کا! چودہ مستند حوالے! ذرا غور فرمائیے۔۔۔۔۔" "میں نے پڑھا ہے" میں نے تنگ آکر کہا۔

"مگر یہ سب۔۔۔۔۔"

"میں نے پڑھا ہے میں نے کل کتاب پڑھی ہے" یہ کہہ کر میں انداز بے نیازی کے ساتھ پھر مشغول ہو گیا مگر مشکل سے دس منٹ گزرے ہونگے کہ انھوں نے اپنی رانیں پیٹ ڈالیں اور بے تاب ہو کر پھر مجھ سے کہا یعنی یہ دیکھئے کہ۔۔۔۔"

میں نے کچھ جل کر بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "میں نے پڑھا ہے"

"آپ یہ دیکھئے کہ یہ حضرت۔۔۔۔"

"میں نے پڑھا ہے" ذرا زور دے کر میں نے کہا "میں نے کل کتاب دو مرتبہ پڑھی ہے اور۔۔۔۔"

"تو پھر" وہ بیچ میں بات کاٹ کر بولے "تو پھر آپ نے خود دیکھ لیا ہوگا کہ مصنف نے غضب ہی کر دیا ہے کہاں کہاں سے مواد جمع۔۔۔۔۔"

"ارے صاحب میں نے پڑھا ہے" اب رو کر میں نے کہا "میں نے سب پڑھا ہے" اس پر وہ حضرت یہ سن کر کچھ گنگنا کر پڑھنے لگے اور انگلی نچا کر زور دے کر خود ہی لطف اندوز ہونے لگے۔ میں اب دق ہو گیا تھا کہ الٰہی اب کیا کروں کہاں بھاگ جاؤں میری کتاب اس وقت میرے لئے اسقدر دلچسپی کا سامان پیدا کر رہی تھی کہ بیان سے باہر۔ اور یہ موذی پن ان کا میرے لئے جہنم تھا جوں توں کر کے میں نے اپنے رنج اور غصہ کو فرو کیا اور پراگندہ دماغ کو پھر کتاب کی طرف متوجہ کیا اب میں کتاب کے انتہائی دلچسپی کے حصہ پر پہنچ گیا تھا اور خوش قسمتی سے یہ حضرت بھی منہمک تھے مگر بد قسمتی۔۔۔۔ ہاں میری بد قسمتی کہ یہ حضرت پھر ایک دفعہ پھاند پڑے

"خوب یہ بھی آپ نے دیکھا ہے"، گویا مجھے مخاطب کر کے پھر بولے "اجی حضرت یہ بھی دیکھا ہے کہ مصنف نے خود ــــ"

"میں نے د ے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھا ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" مگر انھوں نے میری بات کاٹ دی اور کہا "مصنف نے خود اپنی طرف سے کوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"میں نے پڑھا ہے"، اب پھر رو کر میں نے عجیب لہجہ میں کہا "میں نے سب پڑھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر وہ تو گویا میری کوئی سنتے ہی نہ تھے چپ نہ ہوئے بلکہ بولے "۔ ۔ ۔ ۔ کوئی بھی بات نہیں چھوڑی"، اب گویا میں اور وہ دونوں ساتھ ساتھ بول رہے تھے میں اپنے ناتمام جملہ کی فکر میں اور وہ اپنے ناتمام جملے کی تکمیل کی فکر میں چنانچہ میں نے کہا "میں نے پڑھا ہے سب پڑھا ہے" میں رو رو کر گویا کہہ رہا تھا مگر وہ اب خون کرنے پر آمادہ تھے اپنی دھن میں وہ بولے "ذرہ بھر مصنف نے کسی طرف سے" "میں نے پڑھا ہے" اب بڑی لجاجت سے میں نے سمجھا کر اسے کہا "حضرت میں نے سب پڑھا ہے"، شکر ہے کہ اب وہ پھر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے مگر میرا مشغول ہونا دشوار تھا۔ دبلا تپلا آدمی مارے غصہ کے خون کھول رہا تھا مشکل سے غصہ رفع ہونے پایا تھا کہ اب کی مرتبہ مجھے قتل کرنے ہی کی نیت کر بیٹھے۔

وہ "اوہو ۔ ۔ ۔ ۔ ہو جناب من ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میری طرف پشت کئے ہوئے اور نظر کتاب پر۔

میں ــــ "میں نے پڑھا ہے" پھر رو کر اور کچھ برافروختہ ہو کر

وہ ــ "اوہو ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں ــ "میں نے پڑھا ہے"، رونے اور برافروختہ ہونے کے علاوہ زور بھی دیکر

وہ "اس صفحہ پر ...."

میں "میں نے پڑھا ہے" (بالکل رو کر اور تنگ آ کر۔ گویا زندگی سے ہاتھ دھو کر)

وہ۔ "میں آپ کو عبارت ہی سنائے دیتا ہوں۔"

میں "میں نے پڑھا ہے" موت کی تکلیف اٹھاتے ہوئے میں نے کہا لیکن وہ میری بھلا کب سنتے مست ہو کر انگلی ہوا میں مار مار کر باآواز بلند انھوں نے مجھے سنانا شروع کر ہی دیا ان کی پشت میری طرف تھی کتاب ان کے سامنے اور انگلی کا جھٹکا میری طرف۔ انھوں نے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"..... تمام دنیا کے مورخین اس بات پر متفق ....."

بات کو ناتمام یہاں چھوڑ کر عرض کرتا ہوں کہ حضرت نہ میں پہلے بدتمیز تھا اور نہ اب ہوں نہ پہلے کبھی وحشی تھا اور نہ اب نہ پہلے کبھی بیل تھا اور نہ اب بہت کم گو بہت ... میں صلح کل خاموش طینت کمزور بزدل صفت کتابوں کا کیڑا مگر انسان۔ اور انسان پھر انسان ہے سہ

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود   بر آرد ز چنگال چشم پلنگ

کسی نے سچ کہا ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد ان حضرت کی ضد بدتمیزی اور جارحانہ کارروائی نے میرے لئے موت اور زیست کا سوال پیش کر دیا۔ غصہ انتہائی جلال کمزور آدمی۔ پاگل ہو گیا دیوانہ ہو گیا۔ وحشی ہو گیا۔ نہایت شرم کے ساتھ مجھکو قبول ہے کہ "اسفل السافلین" کی تفسیر بن کر غیظ و غضب میں عقل و ہوش سب کھو بیٹھا اب صرف ایک ہی علاج تھا۔ میں کر گزرا...... ان کا جملہ تھا...

... تمام دنیا کے مورخین اس بات پر متفق ......" ان کے آخری لفظ "متفق" کے آخری ٹکڑے "فق" کے ساتھ ہی میں نے مجبور ہو کر گویا حفاظت خود اختیاری

میں اپنی کرسی کا بڑا گدا گھسیٹ کر پوری قوت سے "آ..... ہم" کرکے بے خبری میں ان کے سر پر اس زور سے گھما کر مارا ہے کہ سفق کی بجائے "قع قع قع قع قع" اس زور سے برپا ہوا کہ ساری لائبریری میں واللہ اعلم کس طرح ق اور ع (ملے ہوئے) ان کے گلے سے چھینٹوں کی طرح اڑ کر جیسے بکھر گئے اور میں کرسی پھاند کر بدحواسی میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔

چشم زدن میں لائبریری کے احاطہ کی دیوار پھاند کر کھیتوں کھیت ڈاک گاڑی کی رفتار سے (بہت تیز دوڑتا ہوں) اڑا جا رہا تھا نہ دیکھوں خندق نہ کھائی سامنے ایک باڑھ نظر آئی..... کترا کر نکل جاؤں مگر حضرت وقت کہاں لہذا اس ارہر کے جھانکڑوں کی باڑھ پر سے اڑنے کی کوشش جو کی تو الجھ کر گرا۔ بوکھلا کر اٹھا مڑ کر لائبریری کے برآمدہ کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کھڑے دیکھ رہے ہیں بے اختیاری کے عالم میں ان کے ہاتھ میں کتاب دیکھتے ہی زور سے پکار کر میں نے وہیں سے ہاتھ اٹھا کر کہا "میں نے پڑھا ہے۔"
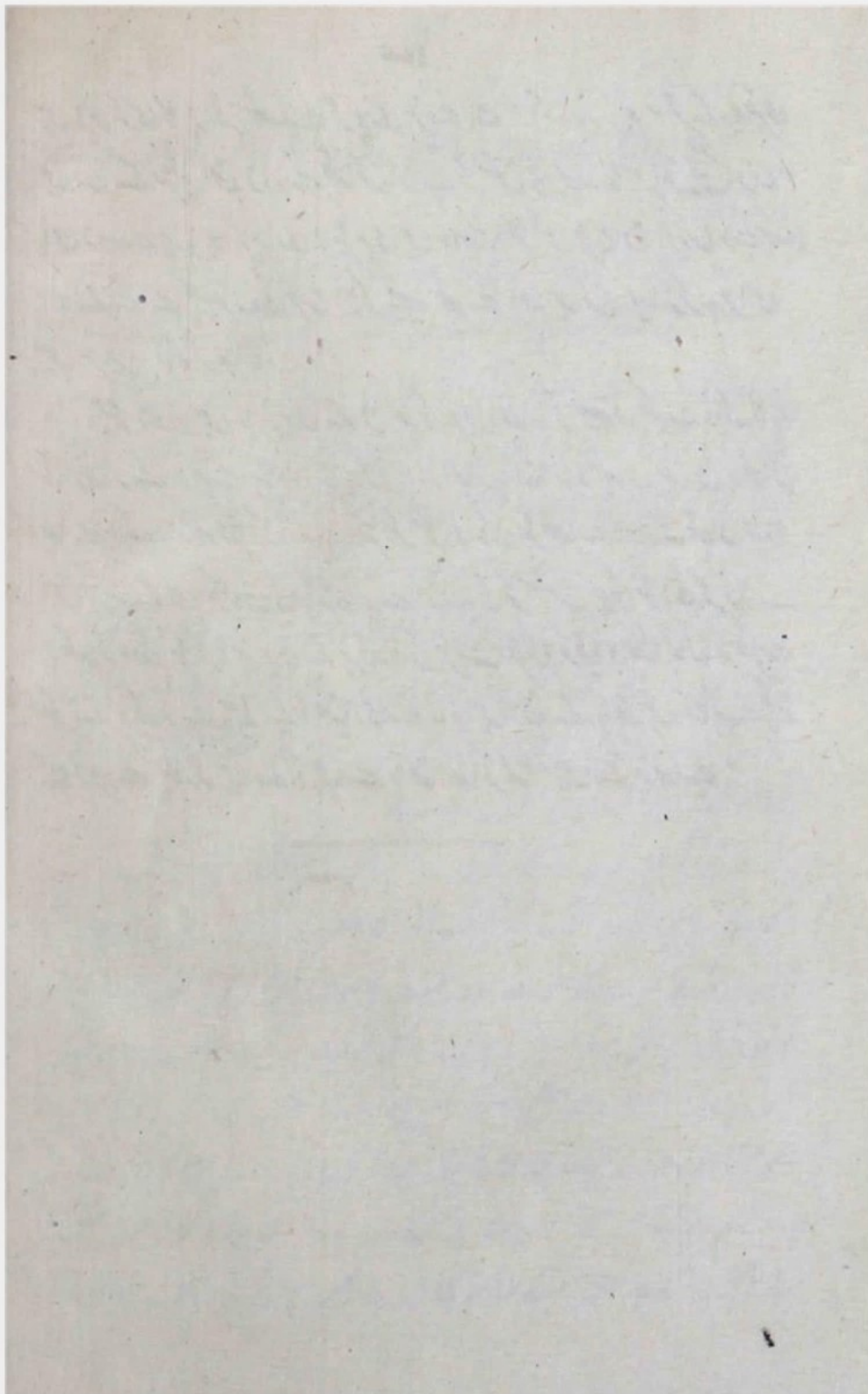
سید سخی حسن

امروہہ کے ایک نوجوان ادیب ہیں جن کے کردار نگاری کے نمونے
"نمک پارے" کے نام سے شائع اور مقبول ہو چکے علی عباس حسینی لکھتے ہیں
"سخی حسن صاحب کی نظر باریک بیں، طبیعت بذلہ سنج، دماغ دقیقہ رس
اور قدرت بیان ماہرانہ ہے ان کی تحریر میں تضحیک بھی ہے ظرافت بھی
اور طنز بھی وہ ہنسی کی بات میں بھی ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں ان کا
مطالعہ وسیع ہے اور وہ روزمرہ کے واقعات اور گرد و پیش کے حالات
کے مضحک پہلو بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے اجاگر کر دیتے ہیں نمک پارے
ہی سے انکا ایک مضمون "ہمارے میر صاحب" نمونہ کے طور پر دیا جاتا ہے۔

ہمارے میر صاحب

ہمارے میر صاحب نسلاً تو چوکھے سید ہیں لیکن میر صاحب انھیں صرف خاص خاص لوگ کہتے ہیں عام طور پر وہ "ڈاکٹر صاحب" کہلاتے ہیں انھوں نے نہ تو کبھی ڈاکٹری پاس کرنے کا جرم کیا اور نہ وہ کبھی مطب کرنے کے خبط میں مبتلا ہوئے حتی کہ ان بیچارے نے ان ڈاکٹروں کی طرح جن کی شیشیاں دواؤں سے اور مطب مریضوں سے خالی رہتے ہیں اپنے مکان پر کوئی چھوٹا موٹا سائن بورڈ بھی نہیں لگایا پھر بھی لوگ انھیں ڈاکٹر کہتے ہیں دراصل یہ ایک معمہ ہے جس کا حل شاید یہ ہے کہ چونکہ ان کے والد ڈاکٹر تھے اس لئے لوگوں نے "باپ پر پوت ۔ ۔ ۔ ۔ " والی مثل پر عمل کرتے ہوئے انھیں تھوڑا تھوڑا ڈاکٹر سمجھ لیا ہے۔ ان کا آبائی وطن کہیں بھی ہو مگر یہاں ان کے مکانات باغات اور جائداد ہے ان کے والد نے ترک وطن کر کے اس قصبہ میں سکونت اختیار کرلی اور اب شہر کا بچہ بچہ یہی جانتا ہے کہ میر صاحب یہیں کے رہنے والے ہیں۔

جس مکان میں وہ رہتے ہیں ان کا ذاتی مکان ہے جس کے دو حصے ہیں۔ ایک میں مردانہ ہے دوسرے میں زنانہ۔ زنانے حصہ کے متعلق اس سے زیادہ نہیں معلوم کہ اس میں میٹھے پانی کا ایک کنواں ہے۔ مردانہ حصہ ایک مختصر مگر آرام دہ بیٹھک ہے جس کا صحن چھوٹا مگر خوش نما ہے صحن کے اندر بے شمار گملوں میں رنگ برنگی پھلواریاں لگی ہوئی ہیں۔ صحن کیا ہے ایک لالہ زار ہے جس سے برکھا رت میں میر صاحب پلنگ پر لیٹ کر گھر بیٹھے بہار کا لطف اٹھاتے ہیں صحن میں ایک طرف بڑی سی چوکی بچھی رہتی ہے جو بارش دھوپ اور آندھیوں میں ٹس سے مس نہیں ہوتی گرمی میں

رات کی اور جاڑوں میں دو پہر کی نمازیں میر صاحب اسی چوکی پر پڑھتے ہیں لیکن اسی چوکی پر بارہ مہینے پانی کے گھڑے رکھے رہتے ہیں اور مکان میں چونکہ گھڑونچی نہیں ہے اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ یہی چوکی گھڑونچی بھی ہے واقعہ یہ ہے کہ چوکی جا نماز کم اور گھڑونچی زیادہ ہے چوکی کے پاس قطب مینار کھڑا ہے یعنی ایک طویل القامت تاڑ کا درخت جسے چھتیس سال پہلے خود میر صاحب نے سینچا اور پروان چڑھایا تھا تاڑ کے اتنے سیدھے اور بلند درخت کمیاب ہیں اب یہ آسمان سے باتیں کرتا ہے اور کچھ مدت میں آسمان میں تھگلی لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

میر صاحب کا کمرہ جو ایک سہ دری ہے ہمیشہ آراستہ رہتا ہے اس میں دری اور قالین کا فرش تو نہیں ہے البتہ چھت گیری بارہ مہینہ لگی رہتی ہے کرسیوں اور میزکی ترتیب میں موسمی تبدیلی کے علاوہ کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ تبدیلی بس اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ بڑی میز کا جو شمالی دیوار کے پاس بچھی رہتی ہے ان کرسیوں سے جو پالٹ میں رہتی ہیں تبادلہ کرا دیا جاتا ہے اس تبدیلی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس طرف زنانہ میں جانے کے لئے ایک دروازہ ہے جس سے گرمی میں ٹھنڈی ہوا آتی ہے اس لئے نشست کا مرکز کوٹھری والی طرف سے اس کے مقابلہ والی دیوار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے دراصل میر صاحب یکساں رفتار سے چلنے کے قائل ہیں۔ اور تبدیلی کو گناہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک ہر وہ چیز جو پرانی ہے مقدس ہے وہ اس معاملہ میں دجان بل، کی سی خاصیت رکھتے ہیں۔

بڑی میز پر ایک لمبا چوڑا میز پوش پڑا رہتا ہے جس کے تین چھور اتنے لٹکے رہتے ہیں کہ میز کے نیچے رکھی ہوئی چیزیں تا وقتیکہ جھانک کر نہ دیکھا جائے نظر نہیں آ سکتیں میز کے نیچے لیمپ بتی کے تیل کی بوتل پینے کی تمبا کو اور کوئلوں کا اسٹاک جمع رہتا ہے۔ میز کے اوپر بیچ میں ایک پرانا مگر خوبصورت گلدان رکھا رہتا ہے

جس میں ایک خاص قسم کی سوکھی گھاس جسے لال پیلے اور سبز رنگوں سے رنگا گیا ہے
سجی رہتی ہے اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا آئینہ کنگھا کپڑے صاف کرنے کا برش
ایک عدد گرد آلود قلمدان جس میں ایک ٹوٹا پھوٹا قلم بھی پڑا رہتا ہے اور ایک عدد
پیڈ جس کے استعمال کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے رکھے ہوئے ملتے ہیں اسکے
علاوہ ایک پرانی چال کا فرشی لیمپ دو تین شیشے کے گلاس اور ٹمبلر اور کیپسٹن
کے خالی ڈبے میں ایک سائز کی کٹی ہوئی جھاڑو کی سینکیں جمع رہتی ہیں جن سے
خلال کا کام لیا جاتا ہے۔

میز کے اوپر والے بڑے طاق میں ایک پرانا دقیانوسی گھنٹہ ہے خود میر صاحب
کے قول کے مطابق اس گھنٹہ کے انجر پنجر سب ڈھیلے ہیں مگر وقت بتانے میں نئی
چال کی فیوری لیوبا اور ویسٹ انڈ کی قیمتی اور نازک گھڑیاں اسکا مقابلہ نہیں
کر سکتیں میر صاحب اور اس گھنٹہ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں مثلاً میر صاحب
ایک "قطب" ہیں تو یہ گھنٹہ سوا قطب ہے میر صاحب جہاں دیدہ ہیں تو گھنٹہ
زباں دیدہ ہے میر صاحب بوڑھے ہونے کے باوجود بوڑھے نہیں لگتے تو یہ
گھنٹہ بھی پرانا ہونے کے باوجود ٹھیک وقت بتاتا ہے میر صاحب کی چال میں
سلامت روی اور زندگی میں یکسانی پائی جاتی ہے تو گھنٹہ بھی اسی کا دعویدار
ہے المختصر اگر میر صاحب اور گھنٹہ میں مابہ الاشتراک باتوں کا توازن کیا جائے
تو یہ طے کرنا مشکل ہو جائے گا کہ خصوصیات کے اعتبار سے کون ایک دوسرے
سے افضل ہے لیکن گھنٹہ بہرحال گھنٹہ ہے اور معمولی نہیں مالک اسکے میر صاحب
ہیں اس لئے فوراً چھری اور خربوزے کا مضمون بن کر میر صاحب کی فضیلت پر
ختم ہو جاتا ہے۔

کمرے کے عقبی دیوار کے درمیان ایک لمبی الماری ہے جس میں ہمیشہ تالا

پڑا رہتا ہے اس الماری کو کھلتے نہیں دیکھا گیا۔ نہ جانے اس کے اندر کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالی کھو گئی ہے یا پھر تالا جادو کا ہے اور "کھل جا سم سم" جیسے ساحرانہ بولوں کے زور سے صرف اُس وقت کھولا جاتا ہے جب کوئی موجود نہیں ہوتا بہرحال اس میں شک نہیں کہ الماری کے اندر خفیہ اور راز کی چیزیں مثلاً پرانی اور مقدس دستاویزات مقدمات کی مسلیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پوشیدہ رہتی ہیں۔

اسی قسم کی ایک چھوٹی سی الماری اسی دیوار کے جنوبی گوشہ میں لگی ہوئی ہے کہتے ہیں کہ چند سال پہلے تک اس میں بھی اسی قسم کا تالا پڑا رہتا تھا جو اب کھول دیا گیا ہے یہ چھوٹی الماری اپنے پچھلے جنم میں طاق رہی ہوگی جس نے کواڑ لگ جانے سے الماری کی صورت اختیار کر لی ہے اس الماری میں شطرنج کی بساط مہرے ایک آدھ تاش کی گڈی جو کوٹ پیس اور رمی کھیلنے کے کام میں آتی ہے اور ۱۹۲۸ء سے لیکر آج تک کی الیکشن کی فہرستیں محفوظ رہتی ہیں۔

کمرے کی بغل میں ایک کوٹھڑی ہے جو قد و قامت میں کلکتہ کی کال کوٹھری سے کچھ بڑی ہے لیکن میر صاحب کے لئے بہ یک وقت سونے کھانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے متعدد کمروں کا کام دیتی ہے۔ سونے کی چارپائی اس میں پھنسکر آتی ہے مچھر دانی بانسوں میں لگائے جانے کے عوض دیواروں میں کیلیں ٹھونک کر باندھی گئی ہے مچھر دانی کے اندر لیٹ کر یقیں ہے قبر کا لطف آتا ہوگا مگر میر صاحب اس صورت حال سے بالکل مطمئن نظر آتے ہیں۔ بکس چارپائی کے نیچے چھپے رہتے ہیں ایک پوری دیوار کپڑے ٹانگنے کے لئے وقف ہے ایک کونہ میں پاندان پڑا رہتا ہے۔ سامنے والی دیوار سے لگی ہوئی ایک چھوٹی میز ہے جس پر پان سازی کا اسٹاک پھیلا رہتا ہے اس کے اوپر کارنس پر سرمہ دانی صابن دانی منجن کی ڈبیہ

خضاب لگانے کا بکس خط بنانے کے سامان کا ڈبہ اور ایک "سنگ اشرف" کا قلمدان جو ان کے دادا جان کو انعام میں ملا تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کی یادگار ہے اور نہ جانے کیا کیا خاک دھول بھرا رہتا ہے۔

میر صاحب عادتاً وضع کے پابند ہیں اب ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے مگر ان کی چھب سے پتہ چلتا ہے بیس پچیس سال پیشتر بڑے رنگیلے جوان رہے ہونگے۔ شہر میں ترکی ٹوپی پہننے والے اور وہ بھی شیر گولا آپ تنہا رہ گئے ہیں میر صاحب کے پاس کئی کئی شیروانیاں اور کئی کئی جوڑے جوتوں کے رہتے ہیں پاجامہ ہمیشہ چست پہنتے ہیں جس میں نصف ساق تک چوڑیاں ہوتی ہیں یہ چوڑیاں نہایت باریک اور مہین ہوتی ہیں اور بڑی احتیاط اور کاوش سے کافی وقت صرف کرنے کے بعد بنائی جاتی ہیں ان کے بعض احباب کو شکایت ہے کہ میر صاحب پاجامہ پہننے میں بہت وقت صرف کرتے ہیں لیکن میر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ چست پاجامہ اتنے جلدی سٹ سے چڑھا سکتے ہیں کہ اعتراض کرنے والے اپنا ڈھیلا پائچہ اتنے جلد نہیں پہن سکتے۔ سیاہ شیروانی میں پتلی پتلی ہرن کی سی دو سفید ٹانگیں اس طرح برآمد ہوتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کالے بادلوں میں بجلی کوندرہی ہے اور اس پر سیاہ پمپ میر صاحب کو رشک جان عالم بنا دیتا ہے۔

میر صاحب کی مونچھیں نرالے کٹ کی ہیں مونچھوں کو سنوارنے کا میر صاحب خاص اہتمام کرتے ہیں جو بھتے روز شیو کرنے کے ساتھ مونچھوں میں خضاب لگانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی وزیر کو پارلیمنٹ میں سوالوں کا جواب دینا۔ مونچھ دار حضرات واقف ہیں کہ مونچھوں کے کٹ مختلف ہوتے ہیں ایک وہ مونچھیں ہوتی ہیں جو چہرہ کے ڈائل پر ہمیشہ گیارہ بج کر پانچ منٹ بتاتی ہیں ایک وہ ہوتی ہیں جو سوا نو بجاتی ہیں اور اتنی نوکدار اور سخت ہوتی ہیں کہ بے خیالی میں کسی کو چبھ جائیں

تو ہتھیار کا کام دیں اور سوراخ کر دیں۔ ایک وہ بے چاریاں ہوتی ہیں جو آٹھ بیس بجاتی ہیں اور اتنی گھنی ہوتی ہیں کہ ان پر مصنوعی ہونے کا دھوکہ ہونے لگتا ہے میر صاحب کی مونچھیں منفرد ہیں دراصل ان کی مونچھوں میں یہ تینوں قسمیں بہ یک وقت پائی جاتی ہیں یعنی ان کی مونچھیں دہن کے آس پاس لبوں سے آٹھ بیس زاویئے سے اتر کر ایک خوبصورت دائرہ بناتی ہوئی گیارہ پانچ والی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر آپ نے قیصر جرمنی کی تصویر دیکھی ہے جو دوسری اچھی اچھی تصویروں کے ساتھ انکے کمرے میں آویزاں ہے تو سمجھ لیجئے آپ کو ان کی مونچھوں کا صحیح اندازہ ہو گیا غالباً مونچھ کی روش میر صاحب نے قیصر جرمنی سے حاصل کی ہے میر صاحب کی مونچھیں یجنسہٖ نہ سہی بہر حال سرقہ بھی نہیں کی گئی ہیں انھوں نے قرینہ کے ساتھ ماخوذ کر کے انھیں اس طرح اپنا لیا ہے جس طرح آغا جانی کشمیری نے ٹینی سن کی اینک آرڈن کو

خود ان کے احباب میں کئی قسم کی مونچھیں رکھنے والے حضرات شامل ہیں بعض مغرب زدہ احباب داڑھی مونچھ صاف رکھتے ہیں۔ ایک انگریزی داں دوست جو آخر الذکر فہرست میں شامل ہیں میر صاحب کے ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہیں تو معاً چندر لیکھا کا وہ سین آنکھوں میں پھر جاتا ہے جس میں جوگن نے چوری چوری محل میں گھسنے کے لئے دونوں دربانوں کو جن میں ایک بے مونچھ اور دوسرا با مونچھ تھا اور جو شطرنج کھیلنے میں محو تھے اپنے حسن گانے اور ناچ سے اتنا مسحور کر دیا کہ وہ چپکے سے اندر گھس گئی اور دربانوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔

میر صاحب کا دائرہ احباب خاصا وسیع ہے یہ دائرہ عمر مذاق نسل پیشے اور روپیہ پیسہ کی اونچ نیچ سے بیگانہ ہے ان کا اخلاق اتنا وسیع ہے کہ ان اوقات کے سوا جب وہ دن رات میں سوتے یا باہر ہوتے ہیں ان کی محفل چوبیس گھنٹے گرم رہتی ہے شام ہوئی اور پروانے گرنے شروع ہوئے جیسے لوبان سلگا اور سردے

آئے۔ رات کی بزم مخصوص ہوتی ہے اس بزم میں چند ایسے احباب بھی شریک ہوتے ہیں جو عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہیں۔ ان میں کانگریس کے بڑے بڑے عہدہ داران میونسپل کمشنر۔ ایم ال اے وکیل۔ تعلیم کے افسر تھانہ دار تحصیل دار سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ ایک صاحب جو انگریزی کپڑے پہننے کے شوقین ہیں اچھے خاصے "مزے ڈگوب" کا نمونہ ہیں ایک صاحب خواہ مخواہ کو بڑ نکال کر چلتے ہیں ایک تیسرے صاحب صورت شکل میں اچھے خاصے ہیں مگر ان کا داہنا ہاتھ بیکار ہے اور کورٹ پیس کھیلتے ہیں جب ان پر پیس جمتی ہے تو کھیلنے والوں کو خاصی الجھن ہوتی ہے ایک اور صاحب ہیں ان کی آنکھوں کا زاویہ ذرا ترچھا گرتا ہے باقی سب ٹھیک ہے ایک صاحب نے خاصی بھلی صورت شکل پائی ہے مگر وہ اتنے نسبتہً قد اور گول مٹول ہیں کہ ان کی چال پر تربوز کے لڑھکنے کا شبہ ہونے لگتا ہے ایک صاحب کا اور کچھ نہیں تو سری تانا ہے میر صاحب کو چھوڑ کر ان کی بزم میں ایک صاحب بھی تو ایسے نہیں جو بے عیب ہوں اور جب یہ سب حضرات جمع ہوتے ہیں تو کمرہ عجائب گھر بن جاتا ہے۔

جن لوگوں نے میر صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا وہ یہی جانتے ہوں گے کہ میر صاحب کا کام دن بھر آرام کرسی پر پڑا رہنا ہے۔ اور بس اور یہ واقعہ ہے کہ جب ان کے مکان کا صدر دروازہ کھل جاتا ہے اور لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے تو میر صاحب پورے قطب ہو جاتے ہیں وہ دن رات میں چار بار کرسی سے اٹھتے ہیں۔ دو بار کھانا کھاتے ہیں دو بار نماز پڑھتے اور اسی میں حوائج ضروری سے فراغت کے لئے وقت نکل آتا ہے لیکن میر صاحب نکمے نہیں ہیں انکی شیروانیاں ہمیشہ صاف ستھری رہتی ہیں جنھیں وہ اپنے ہاتھ سے برش کرتے ہیں۔ ان کے جوتے ہمیشہ چمک دار اور صاف ہوتے ہیں جنھیں وہ خود پالش لگاتے ہیں

ان کی ڈبیہ ہمیشہ پانوں سے بھری رہتی ہے جو وہ خود بنا کر رکھتے ہیں۔ صبح شام ڈیڑھ گھنٹہ پان سازی کے لئے وقف ہے پانوں کی ڈبیہ کرسی کے پیچھے پیر رکھی رہتی ہے خاص خاص مہمانوں کو پان وہ خود پیش کرتے ہیں لیکن بے حیا لوگ بے تکلفی کی آڑ میں خود اٹھا کر کھا لیتے ہیں اس میں میر صاحب بے قصور ہیں۔ ان تمام باتوں سے میر صاحب کی نفاست پسندی سلیقہ مندی اور وضع داری کا پتہ چلتا ہے۔

میر صاحب علی الصباح بیدار ہونے کے عادی ہیں ویسے تو ہر معاملہ میں وقت کے پابند ہیں لیکن کھانا کھانے کے معاملہ میں وقت کی پابندی شدت اختیار کر گئی ہے اور بعض احباب کی طبیعت کے بالکل منافی ہونے کے باعث سخت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ صبح کو دس بجے اور شام کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے میر صاحب کے لئے کھانا کھا لینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا دفتروں اور اسکولوں کیلئے دس بجے کھل کر چار بجے بند ہونا۔ اسی لئے دعوتوں میں پھنس کر میر صاحب کو بڑی الجھن ہوتی ہے کھانا ہمیشہ کوٹھری میں بیٹھ کر کھاتے ہیں رات کو کھانے کے وقت لیمپ سہ دری سے اٹھا کر کوٹھری کے در میں لٹکا دیا جس وقت لیمپ کوٹھری کے در میں ٹنگا ہو تو دور سے سمجھ لینا چاہئے میر صاحب کھانا کھا رہے ہیں۔ میر صاحب شوقیہ طور پر کھانا خود بھی پکاتے ہیں ہر مہینہ "بھائی چارہ" کے موقع پر ان کی اس عجیب و غریب صلاحیت کا امتحان ہوتا رہتا ہے جس میں میر صاحب اول درجہ حاصل کرتے ہیں میر صاحب کی بنائی ہوئی پڈنگ سارے شہر میں مشہور ہے۔

میر صاحب کو اگر تھوڑی دور جانا ہوتا ہے تو تیاری میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے اور کہیں سفر مراد آباد کی دوری کا ہوتا ہے تو تیاری کی مدت اس نسبت سے بڑھ جاتی ہے دوری کے ساتھ تیاری کی مدت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جب میر صاحب

شکار کو جاتے ہیں تو تیاری اس قدر متصل پیچیدہ اور طویل ہو جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے حج کو جا رہے ہیں ایسے اوقات میں اپنے میر صاحب پرشوکت تھانوی والے بٹیر باز میر صاحب کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

پھلواری اور شطرنج کے علاوہ میر صاحب کو شکار کا بھی بہت شوق ہے جواب بد قسمتی سے لائسنس ضبط ہونے کی وجہ سے بالکل ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

خدا نظر بد سے بچائے میر صاحب اخلاص و اخلاق کا مجسمہ ہیں ان کی صحبت آداب و عادات پر مکمل سبق کی حیثیت رکھتی ہے میر صاحب کی بزم افسردہ دلوں میں گدگدی پیدا کرتی ہے جتنی دیر وہاں رہیے فضا میں چہر بازیوں اور مسرتوں کی بارش ہوتی رہتی ہے ان کی مونچھوں کے نیچے چھپی ہوئی ہلکی ہلکی مسکراہٹیں فلک شگاف قہقہے ان کا ذاتی اخلاق انداز تکلم عالی ظرفی خودداری یہ سب باتیں ایسی ہیں جنھوں نے لوگوں کا دل موہ لیا ہے اسی لئے شہر میں میر صاحب کے اتنے اثرات ہیں کہ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں ممبر ہو جاتا ہے وہ گھر سے باہر خوردبینی مقدار میں نکلتے ہیں وہ گھر بیٹھے مہرے لگانے اور چالیں چلنے کے عادی ہیں ان کی سیاسی سمجھ بوجھ اگرچہ مقامی سہی مگر اتنی دوراندیشانہ ہوتی ہے کہ نوخیز سیاستداں ان سے سبق لیتے ہیں۔ الیکشن کے ماحول میں ان کی بیٹھک الکشن بازوں کا اڈا اور امیدواروں کا دفتر بن جاتی ہے میر صاحب کا شمار شہر کے سربرآوردہ حضرات میں کیا جاتا ہے کوئی دعوت پارٹی یا محفل بغیر میر صاحب کے نہیں ہو سکتی میر صاحب دراصل پرانی وضع قطع اور زمیندارانہ ٹھاٹ کے آخری نمونہ رہ گئے ہیں خدا کرے جیتے رہیں۔

ختم شد

گزشتہ لکھنؤ

مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

یہ معرکۃ آرا کتاب عرصے سے نایاب تھی نسیم بکڈپو نے اسے نہایت شاندار طریقے پر دوبارہ شائع کر دیا ہے

لکھنؤ کی تاریخی، جغرافیائی اور تمدنی حالات پر یہ کتاب حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ لکھنؤ کی قدیم شان و شوکت کا حال معلوم کرنے کے لیے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت:۔ چار روپئے آٹھ آنے

مضامین شرر

تاریخی واقعات پر خیال آرائی

مولانا عبدالحلیم شرر کے مضامین کا یہ مجموعہ بھی نایاب تھا، جسے اب شائع کر دیا گیا ہے۔

یہ تمام مضامین تاریخی واقعات پر شرر صاحب کی خیال آرائیوں سے متعلق ہیں۔

اپنی لائبریری میں اس نادر کتاب کا اضافہ فرمائیں

قیمت:۔ مجلد چار روپیے آٹھ آنے

مراثی انیس

میں ڈرامائی عناصر

شارب ردولوی نے میر انیس کے مرثیوں میں ڈرامائی عناصر کی تلاش کر کے یہ کتاب مرتب کی ہے جو اس مبحث پر پہلی ہی کتاب ہے

یہ کتاب میر انیس کے مرثیوں پر بھی نہایت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔

قیمت:۔ تین روپئے

انشائے ماجد

صاحب طرز انشاپرداز اور طنز نگار مولانا عبدالماجد دریابادی عصر حاضر کے مشہور ادیب ہیں آپ کے مضامین کا یہ مجموعہ علم دوست حضرات کے لیے ایک تحفہ ہے۔

جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی انشاپرداز کیسے لکھتے ہیں:۔

قیمت مجلد پانچ روپئے آٹھ آنے

ادبی شاہکاروں میں ایک اضافہ

ہندوؤں میں اردو

مولف :- رفیق مارہروی

جناب رفیق مارہروی نے اپنی عمر عزیز کا کافی حصہ اس عظیم ادبی کتاب کی تالیف میں صرف کر کے اردو کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے اس میں بڑی شرح بسط کے ساتھ ان تمام ہندو شعراء کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے جنہوں نے اردو ادب سے دلچسپی لے کر اُسے پروان چڑھایا

معروف اور غیر معروف ہندو شعراء

کے سوانح حیات اور انتخاب کلام اس نئی "آب حیات" میں یکجا کر کے رفیق مارہروی نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو کو پروان چڑھانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے کم حصہ نہیں لیا۔

اس کتاب کے مطالعے سے آپکو معلوم ہو گا کہ ہندوؤں میں کیسے کیسے باکمال شاعر گذرے ہیں۔

قیمت مجلد 7/8 Rs